معارف

اکتوبر ۲۰۱۶ء

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰/روپئے۔ فی شمارہ ۲۵/روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴/روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰/روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰/روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰/روپئے میں دستیاب۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

✆ (Office Mobile) 09170060782

عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری/منیجر) نے معارف پریس میں چھپواکر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی ودینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۸ ماہ محرم الحرام ۱۴۳۸ھ مطابق اکتوبر ۲۰۱۶ء عدد ۴

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

امریکی صدر بیرک اوباما کا دورِ صدارت اب اپنے آخری مرحلہ میں ہے۔ ۸ سال قبل جب عوامی مقبولیت کے دوش پر سوار صدر موصوف وہائٹ ہاؤس پہنچے تھے تو یہ امریکہ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ تھا۔ چند برسوں پہلے کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی سیاہ فام شخص امریکہ کا صدر بھی ہو سکتا ہے۔ الیکشن کے دوران اور انتخاب کے بعد عالمی مسائل پر انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا اس سے یہ تاثر قائم ہوا کہ وہ آیندہ نسلوں کے لیے دنیا کو ایک بہتر جگہ بنانے کے لیے کام کریں گے، ان کی زیر قیادت امن عالم کو فروغ حاصل ہوگا اور عالمی اور علاقائی سطح پر کشمکش میں کمی ہوگی۔ ان بیانات سے صرف عام آدمیوں نے دھوکہ نہیں کھایا بلکہ بڑے بڑے صاحب بصیرت لوگوں کو بھی دھوکہ ہوا۔ چنانچہ جب کہ بحیثیت صدر انہوں نے ابھی کام کا آغاز کیا تھا کہ ان کا نام نوبل امن انعام کے لیے تجویز کر دیا گیا اور بعد میں یہ انعام ان کو تفویض بھی کر دیا گیا۔ نوبل پرائز کی تاریخ میں محض بیانات اور اچھے ارادوں کے اظہار پر قیام امن کے لیے کسی ٹھوس کام کے بغیر انعام سے نوازے جانے کی کوئی اور مثال نہیں۔ اس کے بعد قاہرہ اور استانبول میں ان کی تقریروں نے عالمِ اسلام کو یہ مسحورکن پیغام دیا کہ ان کی قیادت میں امریکہ عالم اسلام سے مفاہمت اور باہمی تعلقات کی بہتری کے لیے کام کرے گا۔ عراق اور افغانستان سے امریکی فوجیں واپس بلالی جائیں گی، گوانتاناموبے کا عقوبت خانہ بند کر دیا جائے گا اور فلسطین کے مسئلہ پر مذاکرات کو فعّال بنایا جائے گا۔ ۸ سال بعد جب ان کا دورِ صدارت تاریخ کا حصہ بننے والا ہے وہ دنیا اور عالم اسلام کو اس سے بری حالت میں چھوڑ کے جا رہے ہیں جس میں انہوں نے اسے پایا تھا۔ عراق اور افغانستان اب بھی اسی طرح آتش فشاں بنے ہوئے ہیں اور وہاں حالات میں بہتری کے دور دور تک آثار نہیں ہیں۔ امریکہ کی مشرق وسطی کی پالیسی کی کوکھ سے داعش جیسے عفریت نے جنم لیا۔ امریکہ کی عنایت سے لیبیا راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ شام میں جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے اس کا ذکر کوئی کس دل سے کرے۔ مصر میں جمہوریت کا گلا گھوٹنے اور مرسی حکومت کو گرانے کے جرم میں امریکہ پوری طرح ملوث ہے۔ گوانتاناموبے کا آسیب ابھی زندہ ہے۔ ارض فلسطین میں اسرائیلی درندگی اپنے عروج پر ہے۔ امن مذاکرات عملاً ختم ہو چکے ہیں اور دو ریاستی منصوبہ کا اب کہیں کوئی ذکر نہیں۔ ترکی سے تعلقات کشیدہ ہیں۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ جاتے جاتے انہوں نے

اسرائیل نوازی کا جو ثبوت دیا ہے اس کی مثال اسرائیل نواز امریکہ کی تاریخ میں بھی نہیں ملی۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اسرائیلی حکومت امریکہ کی فراہم کردہ بیساکھی کے سہارے کھڑی ہوئی ہے۔ اگر اسے اتنے بڑے پیمانے پر امریکہ کی مالی اور فوجی امداد اور اقوام متحدہ اور دوسرے عالمی اداروں میں اس کی مسلسل اور غیر مشروط حمایت حاصل نہ ہوتی تو اس کے لیے اپنے ناجائز وجود کو باقی رکھنا ممکن نہ ہوتا۔ یہ امداد اسے بالکل ابتداء سے ملتی رہی ہے اور اس میں کبھی کوئی استثنا نہیں ہوا ہے۔ لیکن موجودہ حکومت کی اسرائیل نوازی نے پرانے تمام ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ ابھی ۱۴/ ستمبر کو امریکہ اور اسرائیل کے درمیان جس امدادی معاہدہ پر دستخط کیے گئے ہیں اس کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ امریکہ کی تاریخ کی سب سے بڑی فوجی امداد ہے۔ یہ معاہدہ ایسے وقت میں کیا گیا ہے جب ایک مہینہ بعد ہی امریکہ میں صدارتی انتخابات ہونے والے ہیں لیکن موجودہ حکومت کی عنایت سے مالی اور فوجی مدد کے لیے اسرائیل نئی امریکی انتظامیہ کا محتاج نہیں رہے گا اور بغیر کسی مزید انتظار کے اگلے دس سال کے لیے اپنی فوجی حکمت عملی طے کر سکے گا۔ یہ امداد اگلے دس سال کے لیے ہے اور اس کی مقدار ۳۸ بلین ڈالر ہے یعنی 3.8 بلین ڈالر سالانہ۔ اس سے پہلے یہ امداد 3.1 بلین ڈالر سالانہ تھی۔ اس طرح اس میں 7. بلین ڈالر یعنی تقریباً ۲۲ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ بلاشبہہ اسرائیل کے انتہائی دائیں بازو کے حکمرانوں کی ایک بڑی کامیابی ہے اور اس سے ان کو فلسطینیوں کے خلاف اپنے جارحانہ عزائم کی تکمیل میں بہت مدد ملے گی۔ یہ سمجھنے کے لیے بہت زیادہ دقّتِ نظر کی ضرورت نہیں ہے کہ اس اضافی امداد سے جو اسلحہ اور ساز و سامان حاصل کیا جائے گا۔ وہ کس کے خلاف استعمال ہوگا۔ اسرائیلی حکمراں یوں بھی عالمی رائے عامہ کی چنداں پروا نہیں کرتے۔ وہ امریکی صدر اور امریکی عوام کو بھی کچھ زیادہ وزن نہیں دیتے۔ امریکہ کے دباؤ کے باوجود انہوں نے مذاکرات کے عمل کو یکسر معطل کر رکھا ہے۔ امریکہ، اقوام متحدہ اور دنیا بھر کی مخالفت کے باوجود فلسطینیوں کی املاک پر غاصبانہ قبضہ اور ان پر یہودی بستیوں کی تعمیر کا کام بلا روک ٹوک جاری ہے۔ امریکہ میں اسرائیلی لابی کا جو اثر اور رسوخ ہے اس کے پیش نظر ان کو اس بات کا یقین ہے کہ امریکہ ان کے مفادات کی حفاظت پر مجبور ہے۔ ان کو یہ بھی یقین ہے کہ فلسطینیوں کے خلاف ان کی روز افزوں جارحیت کے عالمی سطح پر کوئی خاص منفی نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ یہ بھی واضح ہے کہ صدر اوباما کے لیے فلسطینیوں کا مسئلہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کے لیے وہ اپنی نیند خراب کریں۔ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ وہ اس مدد کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے اثرات کو دو ریاستی فارمولہ کی

تنقید کے لیے استعمال کریں گے لیکن اگر پوری صورت حال کو سامنے رکھا جائے تو یہ ایک خوش گمانی سے زیادہ کچھ نہیں۔ نہ صرف ان کے لیے بلکہ اگلے پچھلے ہر امریکی ایڈمنسٹریشن کے لیے اسرائیل کو خوش رکھنا ایک مجبوری ہے اور اس کی روز افزوں زیادتیوں کے خلاف ہر پلیٹ فارم پر اس کا دفاع ان کی ذمہ داری۔

اگرچہ اب حکومتی سطح پر بھی بعض ممالک اسرائیل کی غاصبانہ اور جارحانہ پالیسیوں کے خلاف کسی قدر واضح موقف اختیار کرنے لگے ہیں اور Boycott Israel اور Boycott Israeli Producls کی تحریک دن بدن قوت پکڑ رہی ہے لیکن اس سلسلہ میں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ دنیا بھر کے انصاف پسند عوام کے اندر فلسطینیوں خاص طور سے غزہ کے بے یار و مددگار محصورین کے لیے ہمدردی کا جذبہ بڑھتا جارہا ہے اور وہ اس کے اظہار کے لیے نت نئے طریقے استعمال کر رہے ہیں۔ گذشتہ برسوں میں Free Gaza Movement کی سرکردگی میں غزہ کے غیر قانونی اور غیر انسانی محاصرہ کو توڑنے کی برابر کوشش ہوتی رہی ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے رضا کار غزہ کے باشندوں کے لیے امداد لے کر سمندری راستہ سے کشتیوں کے ذریعہ غزہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ۲۰۰۸ء میں انہیں اس ظالمانہ محاصرہ کو توڑنے اور غزہ پہنچنے میں کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد حکومت اسرائیل نے حفاظتی انتظامات اور سخت کر دیے اور پرامن ذرائع سے اس محاصرہ کو توڑنا ناممکن ہوگیا۔ اسرائیلی کشتیوں کو پورے ساز وسامان کے ساتھ ضبط کر لیتے ہیں اور رضا کاروں کو گرفتار کر لیتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ اسی طرح کی ایک کوشش ۲۰۱۰ء میں بڑے المناک نتائج سے دوچار ہوئی ماوی مارمرا پر اسرائیلی کمانڈو حملہ کے نتیجہ میں ۱۰ رضا کار شہید اور بڑی تعداد میں زخمی ہو گئے۔ ان کی اکثریت ترکی سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ شاید محض اتفاق ہے کہ ۱۴ر ستمبر کو جس دن امریکہ اور اسرائیل کے درمیان ۳۸ بلین ڈالر کے غیر معمولی معاہدے پر دستخط ہوئے اسی دن Freedom Plotilla Coalition کی پہل پر بارسی لونا، اسپین سے دو کشتیاں غزہ کے لیے روانہ ہوئیں، ایک کا نام امل اور دوسری کا زیتونہ ہے۔ اس کو Women's Boat to Gaza کا نام دیا گیا۔ اس مہم میں صرف خواتین رضا کار شامل ہیں۔ یہ کشتیاں اس محاصرہ کو توڑ کر اکتوبر کی ابتدا میں غزہ پہنچنے کی کوشش کریں گی۔ اس مہم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اسرائیل کے خلاف فلسطینیوں کی جدوجہد میں عورتوں کی حصہ داری کو اجاگر کیا جائے۔ اس جدوجہد کے تناظر میں فلسطینی خواتین کا کردار غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مہم دنیا کی توجہ ان بہادر عورتوں کے کارناموں کی طرف مبذول کرانے کا کام کرے گی۔

مقالات

علامہ سید سلیمان ندویؒ اور ان کا تفسیری مزاج

مولانا محمد فرمان ندوی

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے عربی زبان وادب اور قرآن کریم کی خصوصی تعلیم ندوہ کے اساتذہ سے پائی تھی، ان کے مشہور اساتذہ میں مولانا حفیظ اللہ بندویؒ، مولانا محمد فاروق چریا کوٹیؒ، مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنیؒ اور علامہ شبلی نعمانیؒ ہیں، ادب ونقد کی کتابیں مولانا محمد فاروق چریا کوٹیؒ سے خاص طور پر پڑھی تھی، ان کے علاوہ علامہ شبلی نعمانیؒ سے بھی خصوصی استفادہ کیا۔ جس سے قرآنی مزاج کی تشکیل ہوئی، علامہ شبلی نعمانیؒ نے جہاں ایک طرف ہندوستان کے علمی وتہذیبی اور ادبی ورثہ کو مالامال کیا، وہیں دوسری طرف قرآنیات کا ایک معتدبہ ذخیرہ چھوڑا، وہ قرآن کو علوم اسلامیہ کی جان اور مسلمانوں کی تعمیر وترقی کی بنیاد سمجھتے اور اس کی تلاوت اور فہم وتدریس کو مومنانہ زندگی کی شان سمجھتے تھے، ایک جگہ فرماتے ہیں: ''قرآن مجید حقائق سے مملو ہے، ذرا غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے''، (۱)۔ ان کا طرز تدریس انوکھا اور نرالا تھا، ایک جگہ خود ہی فرماتے ہیں کہ: ''قرآن کا درس ہو لیکن تحقیق کے ساتھ ہو، سرسری بیکار ہے''۔ (۲)

علامہ شبلیؒ کی قرآن فہمی کے مولف رقم طراز ہیں:

> ''مولانا علم قرآن کو بنیادی اہمیت کا حامل سمجھتے تھے اور اس کی تفسیر کو مروجہ طریقہ سے سرسری طور پر پڑھنے پڑھانے کو ناکافی سمجھتے تھے'' (۳)

علامہ شبلیؒ نے علی گڑھ اور ندوۃ العلماء کے زمانۂ قیام میں قرآن اور علوم قرآن کا درس دیا،

استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

چنانچہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کو انھوں نے ''دلائل الاعجاز'' مولفہ عبدالقاہر جرجانیؒ اور ''اعجاز القرآن'' مولفہ امام باقلانیؒ خود پڑھائی اور قرآن کے اصول بلاغت بھی املا کرائے، علامہ شبلی نعمانیؒ کی اس درجہ عنایت خاص نے اس جوہر قابل کو قرآن کا خوشہ چیں بنا کر صاحب قرآن کے آستانہ مقدس پر لا کھڑا کیا اور پوری زندگی قرآن ان کا اصل سرمایہ اور گراں قدر پونجی ثابت ہوا، اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کی بے تکلف صحبت و رفاقت نے اس ذوق کو تنویر عطا کی، اس حقیقت کا اعتراف علامہ سید سلیمان ندویؒ نے خود ان الفاظ میں کیا ہے:

''سب سے آخری جلوہ قرآن پاک کا نظر آیا، مولانا شبلی مرحوم نے اس کا آغاز کیا اور مولانا حمید الدین مرحوم کی دلچسپ و مفید صحبتوں میں یہ چسکا اور آگے بڑھتا گیا اور اسی کا یہ اثر ہوا کہ سیرت نبوی کی ہر بحث میں قرآن پاک میری عمارت کی بنیاد اور حدیث نبویؐ اس کے نقش و نگار ہیں''۔(۴)

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا قرآنی ذوق: علامہ اقبالؒ نے سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے بارے میں کہا ہے کہ ''سید صاحب علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کے فرہاد ہیں''۔(۵)

علامہ موصوف کا یہ معنی خیز جملہ فکر و نظر کے مختلف زاویوں پر محیط ہے۔ علامہ اقبال علم کی تقسیم کے قائل نہیں، وہ اس کو جزو لایتجزی سمجھتے ہیں۔ جو لوگ اس کو قدیم و جدید کے خانوں میں رکھتے ہیں وہ ان کو کوتاہ نظر مانتے ہیں۔ ان کا یہ مصرعہ اس بات کی قوی دلیل ہے۔ ع

دلیل کم نظری قصۂ قدیم و جدید

اور مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے بقول:

''علم ایک اکائی ہے جو بٹ نہیں سکتی، اس کو قدیم و جدید، مشرقی و مغربی، نظری و علمی میں تقسیم کرنا صحیح نہیں''۔(۶)

اس زاویۂ نگاہ کے تناظر میں اگر سید صاحب کے تمام علمی ذخائر پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو ان کا تفسیری ذوق اور علمی عبقریت ہر میدان میں نمایاں ہوتی ہے، صرف سیرۃ النبیؐ کو دیکھا جائے تو یہ علوم اسلامیہ کا ایک ایسا گنجینہ ہے جو قرآن کا پرتو اور عکس جمیل ہے۔

اسلامی علوم میں قرآن کریم منبع صافی کی حیثیت رکھتا ہے، اسی سے سارے چشمے پھوٹتے

ہیں، حدیثی سوتے بھی اسی سے نکلتے ہیں، قرآن کریم وہ بحر بیکراں ہے کہ اس میں ہزاروں سفینے ڈالے جائیں، پھر بھی اس کی وسعت ''ھل من مزید'' کی صدا بلند کرتی رہے گی، وحید العصر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اسی اصل سے اپنا رابطہ مضبوط کیا۔ اس کی شہادت ان کے شاگرد مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے دی ہے:

> ''عام طور پر لوگ سید صاحب کو مورخ، ادیب کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ خصوصاً علماء کے قدیم حلقہ میں ان کا تعارف اسی سلسلہ سے ہے، لیکن مجھے سید صاحب کی علمی صحبتوں اور ذاتی استفادہ سے معلوم ہوا کہ ان کا امتیازی مضمون قرآن مجید اور علم کلام ہے''۔(۷)

یقیناً ان کا اصل موضوع قرآن تھا، وہ جب بھی لکھتے تو ان کے شگفتہ قلم سے ایسے تابدار موتی نکلتے، جو شذرات (سونے کے ٹکڑے) کی حیثیت رکھتے اور بالفاظ دیگر وہ یہ کہنے کے لائق تھے کہ ع

آنچہ کردم ہمہ از دولت قرآن کردم

اور بقول مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی ''وہ خود بھی فرمایا کرتے تھے کہ اصلی علوم تو بس قرآن وحدیث ہیں، تاریخ تو ہمارے دستر خوان کی چٹنی ہے جو منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہے۔(۸)

انہوں نے اپنی زندگی کا پورا حصہ ان ہی دو سر چشموں (قرآن وحدیث) کی تفہیم وتشریح میں گزار دیا۔ وہ ممتاز سیرت نگار، بے مثال مورخ اور لغت کا زبردست رمز شناس تھے، لیکن اصلاً وہ قرآن اور علوم قرآن کے بہترین ترجمان تھے۔ انہوں نے قرآن کو اپنی زندگی کا رہنما بنایا تھا، جو ہر موقع پر ان کی رہبری اور دست گیری کرتا رہتا، تاریخ ہو یا سیرت، ادب عربی ہو یا ادب اردو، نقد وتبصرہ ہو یا شعر وشاعری، ہر جگہ قرآنی اور مذہبی رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ ایک مکتوب میں اپنے صدیق حمیم اور رفیق قدیم مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ:

> ''آپ گلہ کرتے ہیں کہ (معارف میں) مذہبی رنگ تیز ہے، لیکن میں نے آپ کو اور مولوی عبدالباری صاحب کو پہلے ہی تنبیہ کردی تھی کہ اگر مشرقیات کا جلوہ اس میں زیادہ روشن ہے تو یہ ''عاشقان مغربیت'' کا قصور ہے، اب بھی رحم فرمائیے''۔(۹)

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا عشق قرآن کریم سے اتنا شدید تھا کہ وہ مضامین و مقالات کے لیے قرآنی آیات ہی کو بنیاد بناتے حتی کہ خطوط میں بھی ان کا یہ قرآنی ذوق ظاہر ہوتا رہتا، مولانا مسعود عالم ندویؒ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''وہابیت میں غلو اور تشدد نہ چاہیے، تصلب اور تعصب حکم دین میں ہونا چاہیے نہ کہ اشخاص اور ان کے مسالک میں، خواہ وہ حنفیت ہو یا وہابیت، بَلْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنِ (بقرہ:۱۳۵)''۔(۱۰)

ایک دوسرے مکتوب میں ہے:

> ''حضورؐ کی بعثتیں'' کی تعبیر صحیح ہیں، ایک خود حضور کی بعثت، پھر حضور کی امت کی بعثت سائر الامم کی طرف بحکم: کنتم خیر أمة أخرجت للناس''۔(۱۱)

علامہؒ نے قرآن کریم کے مطالعہ کو اپنے روز و شب کا مشغلہ بنالیا تھا، یہ ضرور ہے کہ انہوں نے باقاعدہ کوئی تفسیر نہیں لکھی، لیکن دوران تلاوت اپنے خاص نسخۂ قرآن پر حواشی ضرور رقم کیے جو ان کی فکر و نظر کے ترجمان اور علمی نکات کی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں آیتوں کے عمود کی توجیہ بڑی دلکش ہے۔اس کے علاوہ قرآنیات میں انہوں نے پر مغز مقالات لکھے، جغرافیۂ قرآن پر سیر حاصل بحث کی، قرآنیات سے متعلق ان کی علمی تحقیق کی کمیت ایسی نہیں کہ اس کا احاطہ مشکل ہو، لیکن انہوں نے قرآنی آیات سے متعلق جو کچھ بھی تحریر فرمایا وہ تمام مفسرین ہند میں اپنی مثال آپ اور ماقل و دل کا حقیقی مصداق ہے۔سید صاحب کی محسن کتابوں میں ابن خلکان (ولادت ۶۰۸۔وفات ۶۸۱ھ) کی کتاب وفیات الاعیان بھی ہے، ابن خلکان اس نظریہ کے حامل تھے کہ **العبرة بالقيمة لا بالقامة**، بقامت کہتر بہ قیمت بہتر، یہی وجہ ہے کہ سید صاحب کے یہاں تصانیف کی بہتات نہیں۔لیکن جو کچھ بھی ہے، وہ تحقیقی دنیا کے لیے سرمایہ افتخار ہے۔

ترجمۂ قرآن کا ادبی پہلو: اللہ تعالیٰ نے علامہ کو منجملہ تمام خصوصیات کے ایک خصوصیت یہ بھی عطا فرمائی تھی کہ انہیں اردو زبان و ادب پر مکمل عبور تھا، اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے اردو کے گیسوئے پرخم کو سنوارنے اور نوک و پلک درست کرنے کا غیر معمولی کارنامہ انجام دیا تو بیجا نہ ہوگا۔اسی وجہ سے قلم کی رعنائی ہمیشہ ان کی تحریر کو خوبصورت بناتی رہی۔

علامہ نے جہاں کہیں اپنی تحریروں میں قرآن کی آیتیں پیش کی ہیں ان کا ترجمہ کسی مفسر یا مترجم کے ترجمۂ قرآن سے نقل نہیں کیا ہے، بلکہ اپنے علم و بصیرت اور وسیع مطالعہ کی روشنی میں خود اس مہتم بالشان کام کو انجام دیا ہے۔

زبان و ادب کے ماہرین جانتے ہیں کہ جس طرح الفاظ کا ایک ظاہری قالب ہوتا ہے، اور اس میں طاقت و قوت ہوتی ہے، اسی طرح اس کی ایک معنوی حالت ہوتی ہے وہ بھی اپنا خاص اثر رکھتی ہے اور بقول مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ:

> ''لسانیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جیسے اشیاء اور خارجی موجودات کا درجۂ حرارت (Temperature) ہوتا ہے، ویسے الفاظ کا بھی ایک ٹمپریچر ہوتا ہے اور جیسے اجسام کا ایک سائز ہوتا ہے، الفاظ کا بھی ایک سائز ہوتا ہے''۔ (۱۲)

علامہ سید سلیمان ندویؒ جیسے وسیع النظر عالم کی نظر سے یہ نکتہ کیسے پوشیدہ رہتا اسی لیے انہوں نے ترجمۂ قرآن میں اس اہم گوشہ پر حد درجہ توجہ دی، بلاشبہہ سید صاحب کے ترجمہ قرآن کو امتیازی حیثیت دینے میں ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی اور دیگر مترجمین کے تراجم کا تقابلی مطالعہ: ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' میں تمام مترجمین قرآن نے رحمان و رحیم کا ترجمہ ''بہت مہربان اور نہایت رحم کرنے والا'' سے کیا ہے، لیکن سید صاحب نے ان کو اسمائے ذات میں شامل فرمایا ہے اور ان کا ترجمہ کرنے سے گریز کیا ہے، دلیل کے طور پر سورۂ اسراء کی آیت قُلِ ادۡعُوا اللّٰهَ أَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ پیش کی ہے۔ ذیل میں اس کے چند نمونے دیے جاتے ہیں:

پہلا نمونہ: شروع کرتا ہوں ساتھ نام اللہ بخشش کرنے والے مہربان سے۔ (شاہ عبدالقادرؒ) شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے، جو بڑے مہربان اور نہایت رحم والے ہیں۔ (حضرت تھانویؒ) اللہ ہی کے نام نامی اور اسم گرامی کی اعانت اور امداد سے، جو بیحد مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ (ترجمہ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ) شروع اللہ نہایت مہربان، بار بار رحمت کرنے والے کے نام سے۔ (مولانا دریابادیؒ) شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والا۔ (مفتی شفیع عثمانیؒ) شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ (مولانا محمد جوناگڑھیؒ)

شروع اللہ کے نام سے جو الرحمٰن ہے، الرحیم ہے۔ (مولانا ابوالکلام آزادؒ) مولانا آزاد کے سوا اکثر مفسرین نے الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ کیا ہے۔

اب سید صاحب کے ترجمہ کو ملاحظہ فرمائیں:

شروع ہے اللہ کے نام سے جو رحمن ہے، رحیم ہے۔　　(ترجمۂ سلیمانی)

دوسرا نمونہ: 　　''الحمدللہ'' میں عموماً مفسرین نے الف لام کو استغراق کے معنی میں لے کر یہ ترجمے کیے ہیں کہ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں: سب تعریف واسطے اللہ کے پروردگار عالموں کا۔ (شاہ عبدالقادرؒ) سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں، جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے۔ (مولانا تھانویؒ) سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو پالنے والا سارے جہاں کا۔ (مولانا محمودالحسن دیوبندیؒ) ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو جہانوں کا مربی ہے۔ (مولانا دریابادیؒ) سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے (مولانا جونا گڑھیؒ) ہر طرح کی ستائش اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ہے۔ (مولانا آزادؒ) شکر سزاوار حقیقی ہے کائنات کا رب۔ (مولانا امین احسن اصلاحیؒ) حقیقی ستائش اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے جو تمام جہانوں کا پرورش کرنے والا ہے۔ (مولانا محمد ادریس کاندھلوی) سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ (مولانا فتح محمدؒ)

لیکن سید صاحب کا ترجمہ ہے:

''حقیقت حمد، اللہ ہی کے لیے ہے جو مربی ہے ہر ہر عالم کا''۔ (۱۳)

تیسرا نمونہ: 　　اسی طرح ''لبشر'' کے ترجمہ میں علامہ موصوف نے جس لسانی قوت کا لحاظ رکھا ہے وہ ذیل میں مذکور ہے:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلاَّ وَحْيًا أَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَاءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۔(شوریٰ:۵۱) اور نہیں طاقت کسی انسان کو کہ بات کرے اس سے اللہ (شاہ عبدالقادرؒ) کسی کی یہ شان نہیں کہ حالت موجودہ میں اللہ اس سے کلام فرمائے (تھانویؒ) کسی بشر کا یہ مرتبہ نہیں کہ اس سے کلام کرے (مولانا محمودالحسن دیوبندیؒ)

ان ترجموں پر ایک نظر ڈالیے اور سید صاحبؒ کا یہ ترجمہ پڑھیے:

''اور کسی نبی کی یہ تاب نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے''۔ (۱۴)

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ترجمہ میں ''تاب'' کا جو لفظ استعمال کیا ہے وہ ''طاقت'' ''مرتبہ'' ''میسر'' اور ''شان'' سے عظیم تر ہے، نمونے کی ان چند مثالوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی کس قدر زبان کی نوک پلک سے واقف تھے، جس طرح علمائے متاخرین نے شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ کو ''الہامی'' قرار دیا ہے، اسی طرح علامہ سید سلیمان ندویؒ کے فٹ نوٹ اور منتشر ترجمہ و علمی نکات کو وھبی ترجمہ و تفسیر کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اسی کی شہادت مولانا شاہ معین الدین ندویؒ اس طرح دیتے ہیں:

> ''قرآنی علوم پر جب کوئی مضمون لکھتے تو معلوم ہوتا کہ ان کے علم وفن کے شالیمار میں قرآن پاک کی آیتوں کی نہر بہشت بہ رہی ہے''۔ (۱۵)

آیات قرآنی اور فہم سلیمانی، چند نمونے: مفسرین اور ماہرین قرآنیات کے یہاں تفسیری مباحث کو متعین کرنے کے سلسلہ میں ایک اصول رہا ہے کہ خود قرآن کریم کی آیات کو سب سے پہلے اسی کی مثل دوسری آیات کی روشنی میں دیکھا جائے۔ کیونکہ قرآن نے ایک واقعہ کو کہیں مجمل اور کہیں مفصل بیان کیا ہے، اسی کو اصطلاح تفسیر میں ''تفسیر القرآن بالقرآن'' کہا جاتا ہے۔ پھر قرآنی آیات کے ذریعہ وضاحت کے بعد حدیثی ذخائر اور کلام عرب کے استعمالات کی طرف رجوع کیا جائے، علامہ سید سلیمان ندوی نے یہ اصول اپنے پیش نظر رکھا۔

قرآن کی تفسیر قرآن سے: علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنے ذاتی نسخہ قرآن پر قیمتی حواشی تحریر فرمائے ہیں، یہ حواشی تفسیر القرآن بالقرآن کا بہترین نمونہ ہیں، مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کی اس آیت **فتلقی آدم من ربہ کلمات فتاب علیہ** (البقرۃ: ۳۷) پر حاشیہ میں لکھا ہے: **ربنا ظلمنا أنفسنا و ان لم تغفر لنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین** (اعراف: ۲۳)، گویا کلمات کی تشریح سورۂ اعراف کی دعا کی شکل میں ہوئی۔

قرآن کی تفسیر حدیث سے: علامہ سید سلیمان ندویؒ نے قرآن مجید کی تفسیر حدیث سے بھی کی ہے، اس سلسلہ میں سورۂ احزاب کی آیت/ ۶ نقل کر کے سید صاحب کا منہج تفسیر ذکر کیا جاتا ہے، ڈاکٹر سید سلمان ندوی رقم طراز ہیں:

> ''والد ماجدؒ نے ایک سلسلہ شروع فرمایا تھا کہ قرآن کی آیتوں کی تفسیر

حدیثوں سے کی جائے یا جو معنی ومطلب قرآن کی آیت میں ادا ہوتا ہے اس معنی و مطلب کی حدیثیں ان آیات کے ذیل میں جمع کردی جائیں، تاکہ معلوم ہو کہ قرآن پاک متن ہے اور احادیث نبویہ اس کی شرح ہیں۔" (۱۶)

النَّبِیُّ أَوۡلیٰ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ أَنۡفُسِهِمۡ، وَأَزۡوَاجُهٗ أُمَّهَاتُهُمۡ (احزاب:۱)	نبی کو مومنین کے ساتھ ان کے نفسوں سے زیادہ تعلق ہے، اور نبی کی بیویاں ان کی مائیں ہیں

اس آیت پر حاشیہ میں سورۂ توبہ کی آخری مشہور آیت "لَقَدۡ جَاءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ أَنۡفُسِكُمۡ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ (توبہ:۱۲۸)" کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور پھر حسب ذیل حدیث تحریر فرمائی ہے:

لا یؤمن أحدکم حتی أکون أحب إلیه من والده وولده والناس أجمعین (بخاری: کتاب الایمان:۱۵)	تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک معتبر نہیں ہے جب تک کہ میں اس کے والدین، بچوں اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ (۱۷)

مقاطع آیات: علامہ سید سلیمان ندویؒ مقاطع آیات میں مذکور اللہ کے اسماء وصفات کو بہت اہمیت دیتے تھے اور ان سے سابق کے مدلولات کی وضاحت کرتے تھے، بعض دفعہ ایسے گنجلک اور پیچیدہ مسائل جوامت میں موضوع بحث ہوتے اور جن کے انکار سے عقیدہ اسلامی پر ضرب آتی تھی، سید صاحبؒ نے اپنی وسیع النظری اور عمیقانہ تدبر سے آیات کے فواصل (مقاطع آیات) کی ایسی دلنشیں تشریح فرمائی، جس طرح کی تفسیر متقدمین ومتاخرین میں سے بہت کم ہی افراد نے کی یا وہ اس نکتہ تک نہیں پہنچ سکے ہیں، مثال کے طور پر قرآن کے سورۂ نساء کی آیت وَمَا قَتَلُوۡهُ يَقِيۡناً بَلۡ رَفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيۡهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزاً حَكِيۡماً (نساء:۱۵۸)

اس آیت کریمہ کے آخری جز پر سید صاحبؒ نے یہ حاشیہ تحریر فرمایا ہے کہ کونه عزیزاً حکیماً یقتضی أن یکون الرفع أمراً عظیماً اللہ تعالیٰ کی صفت غلبہ وحکمت کا ذکر اس کا مقتضی ہے کہ رفع الی السماء ایک عظیم کام تھا، اگر طبعی موت کا واقعہ ہوتا تو یہ بات سنت عادیہ تکوینیہ کے نوع میں آتی، اس میں غلبہ وقدرت کا اظہار نہیں کیا جاتا، یہ کام ایک مافوق الطبیعاتی کرشمہ کی طرح پیش آیا ہے۔

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ اسی کی وضاحت کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''سید صاحب کا یہ استدلال اس جگہ پر ٹھوس اور نا قابل انکار ہے، اس کے ساتھ علوم قرآن کے طالب علموں کے لیے ایک فتح باب بھی ہے، جس سے مطالعہ قرآن کی ایک راہ کھلتی ہے''۔(۱۸)

مولانا عبداللہ عباس ندویؒ نے امام طبریؒ (م ۳۱۰)، امام قرطبیؒ (م ۶۱۷ھ)، امام زمخشریؒ (م ۸۱۵ء)، قاضی بیضاوی (م ۶۹۱ھ) اور امام ابن کثیرؒ کی تفاسیر سے سابق الذکر مقطع الآیت کی تفسیر کا مراجعہ کیا، کسی نے بھی اس طرح اشارۃً یا دلالۃً وضاحت نہیں کی ہے۔ صرف ''روح البیان'' کے مولف شیخ اسماعیل حقی نے اسماء وصفات کو رفع سے متعلق کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سید صاحبؒ کی تفسیر سے قریب تر ہیں۔ شیخ اسماعیل حقی لکھتے ہیں:

''وكان الله عزيزاً حكيماً لا يغالب فيما يريده، فعزة الله عبارة عن كمال قدرته، فان رفع عيسى عليه السلام إلى السموات وإن كان متعذراً بالنسبة إلى قدرة البشر ولكنه سهل بالنسبة إلى قدرة الله تعالى لا يغلبه أحد''۔(۱۹)

حقی کہتے ہیں کہ ''الرفع إلى السماء'' بشر کے لیے ناممکن، مگر اللہ تعالیٰ کے لیے ممکن تھا اور سید صاحبؒ کی تفسیر کا مطلب یہ ہے کہ یہ تو تسلیم شدہ ہے کہ موت دینا یا زندہ اٹھا لینا دونوں بشر کے لیے ناممکن اور اللہ کے لیے آسان ہے، مگر یہاں پر لفظ عزیز بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس قدرت کا اظہار ہے جو خود اس کی سنت تکوینی یا طبیعاتی نظام کے ماوراء ہے۔

آیات قرآنی کا باہمی ربط: قرآن پاک کی آیات ایک دوسرے سے مربوط ہیں یا علیحدہ ہیں، یہ موضوع بھی علمائے تفسیر کے یہاں مختلف فیہ رہا ہے، امام رازیؒ اور امام بقاعیؒ نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے اور دوسرے علماء نے بھی اس میں کافی غور وخوض کیا ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ کو بھی قرآن کی آیات کے باہمی ربط کا خاصا خیال تھا، اسی وجہ سے علامہ سید سلیمان ندویؒ نے مولانا احمد علی لاہوریؒ کے ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے:

''قرآن پاک کے علوم میں سب سے زیادہ دقیق اور نازک علم آیات اور

سور کے باہم ربط و تعلق کا ہے"۔(۲۰)

اس لطیف و نازک ربط کی طرف علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے حواشی قرآنی میں جا بجا اشارہ کیا ہے۔ڈاکٹر سید سلمان صاحب رقم طراز ہیں۔سورۂ حدید کی آیت (۲۵) ملاحظہ فرمایئے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (حدید:۲۵)

ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلے کھلے احکام دے کر بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب کو اور انصاف کرنے کو نازل کیا تاکہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں اور ہم نے لوہے کو پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے اور لوگوں کے لیے اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں۔

اس آیت میں کتاب و میزان کے ساتھ لوہے کا ذکر جو بظاہر بے جوڑ محسوس ہوتا ہے، اس کی تفسیر کئی مفسروں نے کی ہے اور بعض نے لوہے سے سیاسی و جنگی طاقت مراد لی ہے۔ ہمارے والد ماجد کا حاشیہ ملاحظہ فرمایے اور دیکھیے چند لفظوں میں کیا بلیغ بات فرمادی ہے، فرماتے ہیں:

"طریقان لإقامة القسط أولهما الكتاب والميزان، وثانيهما الحديد (یعنی عدل و انصاف کا قیام دو ذرائع سے ہوتا ہے، پہلا قرآن اور انصاف کے تقاضوں پر عمل کرنا ہے) جو ظاہر ہے کہ خدا اور اس کے سامنے جواب دہی کے احساس سے حاصل ہوتا ہے، لیکن انسان کی فطرت کو دیکھتے ہوئے یہ بھی معلوم ہے کہ احساس مسئولیت پر غفلت بھی غالب آجاتی ہے، ان اہل غفلت کی اصلاح کے لیے قوت کا استعمال کرنا پڑتا ہے، وہ قوت چاہے انفرادی ہو یا حکومتی۔ بس اب کتاب و میزان کے ساتھ حدید (لوہے) کا تعلق واضح ہوگیا"۔(۲۱)

عمود قرآن: اسی طرح علامہ سید صاحبؒ کے یہاں سورتوں کے عمود کے ذکر کرنے کا خاص اہتمام ہے، انہوں نے قرآن پاک کی سورتوں کا مطالعہ کیا اور اس کے مرکزی مضمون کی وضاحت چند لفظوں اور سطروں میں کی، جن سے دیگر مضامین سورت کے سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے، شاید ان کی یہ

سوچ قرآن کریم کے اس آواز پر لبیک کہنے کا نتیجہ ہو جو لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ، لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ اور أَفَلاَ يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ کی شکل میں موجود ہے۔سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں معراج کا بیان سورۂ اسراء (جس کو بنی اسرائیل بھی کہتے ہیں) کی صرف ابتدائی تین چار آیتوں میں ہے، لیکن ہم نے اس سورہ کو شروع سے اخیر تک بار بار پڑھا اور ہر بار اس یقین کے ساتھ ختم کیا کہ یہ پوری سورت معراج کے اسرار و حقائق ، نتائج وغیرہ اور احکام واعلانات سے معمور ہے"۔(۲۲)

ڈاکٹر سید سلمان ندوی تحریر فرماتے ہیں کہ "سورۂ ہود کی ابتداء میں تحریر فرمایا ہے کہ هذه السورة تسلية للنبى صلى الله عليه وسلم یعنی یہ سورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دلاسے کے لیے نازل فرمائی گئی"۔(۲۳)

اس سورت کے مشمولات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں مختلف انبیاء کو اپنی اپنی قوموں میں جن مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کا تذکرہ کیا گیا ہے، تاکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ تسلی رہے کہ قریش نے جن مشکلات و مسائل کی آپ پر بوچھار کی ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ سارے انبیاء نے وہ تکلیفیں برداشت کی ہیں، کسی کو زدوکوب کیا گیا، کسی کو مارا گیا، کسی کو آرہ کے ذریعہ چیر کر تکابوٹی کر دیا گیا اور کسی کے ساتھ سب وشتم کا معاملہ روا رکھا گیا۔غرض نوع بہ نوع کے مسائل میں ان کو الجھایا گیا، تاکہ وہ کار دعوت سے باز آئیں۔

تحقیق الفاظ کی ندرت: علامہ سید سلیمان ندویؒ کو خلاق ازل نے پاکیزہ تحقیقی ذوق عطا فرمایا تھا، وہ نصوص واصول کی مراجعت کے قائل اور مفردات والفاظ کی تحقیق کے داعی تھے، ان کی تمام تحریروں خاص طور سے ارض القرآن میں یہ وصف پورے جمال وکمال کے ساتھ موجود ہے، ایک لفظ "شرح صدر" کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

"شرح کے لغوی معنی عربی میں چیرنے پھاڑنے کے ہیں، اسی سے طب کی اصطلاح علم تشریح اور تشریح اجسام نکلی ہے۔چونکہ چیرنے اور پھاڑنے سے اندر کی چیز کھل کر نمایاں ہو جاتی ہے، اس لیے اس سے تشریح امر اور تشریح کلام، شرح

بیان اور شرح کتاب وغیرہ مجازی معنی پیدا ہوتے ہیں، اسی سے ایک اور محاورہ شرح صدر کا پیدا ہوا ہے جس کے معنی سینہ کھول دینے کے ہیں اور کلام عرب میں اس سے مقصود بات کا سمجھا دینا اور اس کی حقیقت کا واضح کر دینا ہوتا ہے، قرآن مجید اور احادیث میں یہ محاورہ بہ کثرت استعمال ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب فرعون کے پاس جانے کی ہدایت ہوئی تو آپ نے دعا مانگی: رب اشرح لی صدری‘‘۔(۲۴)

اسی طرح اعلام القرآن، عرب، عاد، ثمود، مدین، حنیف، لات، عزی، مناۃ، ہبل، سواع، یعوق، یغوث، نسر وغیرہ کی اطمینان بخش تحقیق کی ہے اور مراجع ومصادر سے اس کی اصل کو واضح کیا ہے۔ نیز اصطلاحات قرآن خواہ شعبہ عبادات سے متعلق ہوں یا اخلاقیات سے، معجزات سے میل کھاتی ہوں یا معاملات سے، ان کی مصادر لغت کی روشنی میں وضاحت کی ہے، قرآنی الفاظ کے معانی متعین کرنے میں سید صاحبؒ نے استقراء سے بھی بہت زیادہ مدد لی، وہ ایک لفظ کے تمام مواقع استعمال اپنے پیش نظر رکھتے اور اس کا صحیح مفہوم متعین کرنے کی کوشش کرتے ۔

تفسیری نکات: قرآنی آیات سے نکات وبدائع کے استخراج میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کو جو کمال حاصل تھا وہ ان کے معاصر علماء میں کمیاب ہے، علامہ سید سلیمان ندوی نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے دو نکات نکالے ہیں:

۱۔ یہاں رحمٰن اور رحیم بدل معنی کے طور پر ہیں۔

۲۔ اس میں عیسائیوں کے اعتراض کا جواب بھی آ گیا جو مسلمانوں کے خدا کو محض جبار وقہار بتاتے تھے۔(۲۵)

مولانا عبداللہ عباس ندویؒ ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’سید صاحب نے فرمایا کہ ’’الرحمٰن الرحیم‘‘ لفظ جلالت کا بدل معنی ہے، اس کی طرف کسی کی نظر نہیں گئی تھی۔ اور جو لوگ عربی نحو سے واقفیت رکھتے ہیں وہ اس کی قدر کریں گے کہ بدل معنی نے مفہوم کو کس قدر بلند کر دیا، اور کس درجہ پڑھنے والے کو قرآن کریم کی عظمت کا احساس ہوا‘‘۔(۲۶)

قرآن کریم میں اوقات نماز سے متعلق جو آیتیں آئی ہیں ان میں ظہر اور عصر کی نمازوں کے اوقات کہیں مجمل اور کہیں مفصل ہیں، اور کہیں تو دونوں کو ایک لفظ ''قبل الغروب'' یا ''أصیل'' یا ''طرف النهار'' کہہ کر بیان کیا گیا ہے، مثال کے طور پر سورۂ ق کی یہ آیت پڑھیے: (فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَايَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدُ (ق:۳۹)(پس ان مخالفوں کے کہنے پر اے رسول! صبر کر اور آفتاب کے نکلنے سے پہلے (صبح) اور اس کے ڈوبنے سے پہلے (عصر) اپنے پروردگار کی حمد و تسبیح کر، اور کچھ رات گئے (عشاء پر اس کی تسبیح کر اور آفتاب کے سجدہ کرنے کے بعد یعنی غروب کے بعد (مغرب کے وقت) اس کی تسبیح کر)۔

سورۂ روم میں ارشاد باری ہے: فَسُبْحَانَ اللهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ۔ (روم: ۱۸) (اور اللہ کی تسبیح کرو جب شام (یا رات) کرو اور جب صبح کرو، اور اس کی حمد آسمان اور زمین میں ہے اور اخیر دن کو اس کی تسبیح کرو اور جب ظہر کرو) موخر الذکر آیت میں شام کی نماز (مغرب وعشاء) کے بارے میں ''حین تمسون'' فرمایا گیا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ اس اجمال پر غور کرنے سے ایک عجیب نکتہ حل ہوتا ہے اور لطیف اشارہ ملتا ہے، فرماتے ہیں کہ:

> ''یہ دونوں مل کر ایک بھی اور علاحدہ بھی ہیں، اسی بنا پر کسی اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر وعصر کو ایک ساتھ اور مغرب وعشاء کو ایک ساتھ ملا کر ادا کر سکتے ہیں، اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت میں ہمیشہ علیحدہ ذکر کی گئی ہے، اسی لیے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہیں ہے، احادیث میں جمع بین الصلوٰتین کے عنوان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی مثالیں اس نکتۂ قرآنی کی تشریح میں موجود ہیں''۔(۲۷)

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی قرآنی خدمات کا یہ مختصر ذکر ہے تاہم اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے قرآن کو کس طرح اپنی زندگی میں منتقل کیا اور ہر لمحہ اس کی خدمت و ذمہ داری کے لیے تیار رہے، تادم حیات وہ قرآن کا درس دیتے رہے، انتقال مکانی نے ان کے مزاج میں

استحکام اور مزید پختگی پیدا کی ،آئندہ صفحات میں قارئین بعض ایسے نمونے بھی پائیں گے جن سے انہیں اندازہ ہوگا کہ علامہ موصوف نے عام گفتگو اور عمومی بول چال میں کس طرح قرآن کی آیت کو بلا تکلف استعمال کیا اور روزمرہ کی زندگی کے الجھے مسائل سلجھائے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا درس قرآن: قرآنی تعلیمات کو عام کرنے اور ہر خاص وعام کے رابطہ کو اس چشمۂ صافی سے جوڑنے کے لیے انھوں نے دروس قرآن کے حلقے قائم کرنے کا فیصلہ کیا، ان کا یہ سوچنا محض نظریاتی نہیں رہا، بلکہ اس کا عملی مظاہرہ بھی تادم حیات کرتے رہے، ان دروس قرآن میں سید صاحب کی زبان سے جو موتی باران رحمت کے چھینٹے اور قطرے کی طرح ٹپکے ان سے تشنہ کاموں کو سیرابی اور گویا نئی زندگی ملی۔ ان کی خواہش تھی کہ عام مسلمانوں تک قرآنی پیغام پہنچانے کے ساتھ نئی نسل کو بھی اس سے روشناس کرایا جائے، ان کی دلی تمنا تھی کہ:

> ’’قدیم درس گاہوں کے فارغ التحصیل طلبہ اور جدید کالجوں کے ایسے تعلیم یافتہ طلبہ جنہوں نے عربی یا اسلامیات میں ایم اے کیا ہو اور جن کو علوم دین سے شغف بھی ہو، ان دونوں قسموں کے طلبہ کو ملا کر ایک باضابطہ درس کا سلسلہ قائم کیا جائے، جس میں صرف علوم قرآنی کی اعلیٰ تعلیم اور کلام اللہ سے استفادہ کے طریقوں کی تفہیم کی جائے‘‘۔(۲۸)

چنانچہ انھوں نے دیسنہ بہار، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، بھوپال اور پاکستان میں دوران قیام اس مبارک سلسلہ کو جاری رکھا اور علم قرآن کے جویا افراد کے لیے الٰہی اور نبوی غذا فراہم کی ، ایک مرتبہ مولانا محمد اویس نگرامی ندویؒ اور ان کے ساتھیوں کو بڑے درد کے ساتھ مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ لوگ تاریخ کے لیے کہتے ہیں، قرآن پڑھنے کے لیے کیوں نہیں کہتے؟ سید صاحبؒ کے درس قرآن کا انداز یہ تھا کہ جو آیت زیر درس ہوتی، اس مفہوم کی تمام آیات کو جمع فرماتے، پھر تمام آیات کو سامنے رکھ کر سیاق وسباق کا لحاظ فرماتے ہوئے مفہوم متعین فرماتے اور اس کو سنت اور اقوال سلف سے مدلل فرماتے۔

اس کا اثر یہ تھا کہ ان کی گفتگو ’’از دل خیزد بر دل ریزد‘‘ کا مصداق تھی ، سامعین ایستادہ کھڑے یا بیٹھ کر درس سنتے ،اور ان کے علمی انداز سے محظوظ ہوتے ، دقیق اور عمیق مسائل چٹکیوں میں

حل فرماتے، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے علم قرآنی کے عام کرنے کے اس سلسلہ کو اپنی زندگی کا ماحصل بتایا ہے، مولانا شاہ معین الدینؒ کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

''بحمد اللہ کہ صبح کی نماز کے بعد ایک گھنٹہ ایک مسجد میں درس قرآن ہوتا ہے، سو دو سو سامعین ہوتے ہیں، جن میں بعض افسران بھی ہوتے ہیں، یہی زندگی کا ماحصل ہے''۔(۲۹)

علامہ سید سلیمان ندویؒ کے درس قرآن کی خصوصیات: قرآن کریم سے عالمانہ انداز میں انتفاع اور استفادہ کے لیے تین شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

۱۔صحیح ایمانی ذوق اور دینی مزاج۔

۲۔منصب نبوت سے تمام و کمال واقفیت اور عہد نبوی کی پوری علمی، عملی، اخلاقی، اعتقادی اور سیاسی تاریخ۔

۳۔عربی پر محققانہ نظر۔

مولانا محمد اویس ندوی فرماتے ہیں:

''ان تینوں ضروری شرطوں کے ساتھ وہ علوم جو فہم قرآن کے لیے ضروری ہیں سید صاحب ان کے بھی محقق اور متیقظ عالم تھے''۔ (۳۰)

علامہ سید سلیمان ندویؒ میں یہ شرطیں بدرجہ اتم موجود تھیں، چنانچہ وہ عصر حاضر کے مذاق و مزاج کے مطابق قرآنی آیات کی ایسی تفسیر فرماتے تھے کہ سننے والا یہ سمجھتا تھا کہ اس سے پہلے یہ بات نہیں کہی گئی تھی۔اسی کے ساتھ سلف مفسرین کا دامن نہیں چھوڑتے تھے، ان پر عقلیت کا نہیں سلفیت کا غلبہ تھا اور ان کا مسلک تاویل نہیں، بلکہ تفویض تھا، مولانا محمد اویس ندوی فرماتے ہیں ''مجھ کو سید صاحب سے قرآن مجید تین طرح سے پڑھنے کا موقع ملا۔فقہی، کلامی، عمومی موضوعات'' درس قرآن کی تیاری میں تفسیر طبری اور تفسیر روح المعانی پیش نظر رہتی تھیں اور نحوی مشکلات کے لیے مغنی اللبیب اور کبھی کبھی ابوحیان کی البحر المحیط کا بھی مراجعہ فرمایا کرتے تھے۔اسی طرح مولانا شاہ عبدالقادر صاحب کے فوائد قرآنیہ، نیز مولانا حمید الدین صاحب کے قرآنی ذوق سے متاثر نظر آتے تھے، علامہ سید سلیمان ندویؒ دوران درس قرآن کریم کی آیات کی لغوی تشریح ایسی فرماتے تھے کہ آیت کا پورا مدلول و

مفہوم سامنے آجاتا تھا۔

مثال کے طور پر ایک درس قرآن میں لفظ ''حنیف'' کی تشریح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ کتب احادیث میں نبوت سے قبل کے سلسلہ میں حضورؐ کے متعلق ایک لفظ ''یتحنث'' کا آتا ہے، جس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ حضورؐ عبادت کیا کرتے تھے، فرمایا کہ میرے ذوق میں یہ لفظ اصل میں ''یتحنف'' ہے، یعنی حضورؐ دین حنیفی (ابراھیمی) کی عبادت کیا کرتے تھے۔(۳۱)

وہ ان لوگوں پر شدت سے نکیر کرتے تھے جنہوں نے عربی زبان کی چند کتابیں پڑھ لیں اور فہم قرآن کے مدعی ہوگئے، دوران درس علامہؒ اس کو ایک بڑے فتنہ کی حیثیت سے ذکر کرتے، نیز بعض علماء کی غلطی کو طلبہ کے سامنے بیان فرما کر کہتے کہ یہ باقاعدہ تعلیم نہ ہونے کی مثالیں ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تحریری قرآنی خدمات: ''سید صاحب کو اسلامی علوم میں حقیقی شغف قرآن سے تھا۔ آیات قرآنی سے کلامی، فقہی اور سیاست اسلامی کے مسائل کا استنباط اور اس کے ادبی لطائف کی تشریح و توضیح اور تاریخی مباحث کی تحقیق ان کی زندگی کا دلچسپ موضوع تھا''۔(۳۲)

قرآنیات کے موضوع پر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے جولائی ۱۹۰۶ء میں ''قضا و قدر اور قرآن'' کے عنوان سے ایک پر مغز علمی و تحقیقی مضمون لکھا۔ جو الندوہ میں شائع ہوا اور خراج تحسین حاصل کرنے کا باعث بنا، پھر اسی سال ''القرآن والفلسفۃ الجدیدۃ'' (الندوہ ستمبر ۱۹۰۶ء) اور ۱۹۰۷ء میں ''مسئلہ ارتقاء اور قرآن مجید'' (الندوہ دسمبر) اور ۱۹۰۸ء میں ''ایمان بالغیب'' (الندوہ دسمبر) میں شائع ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں جب دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو میں علم کلام اور جدید عربی کے ایک استاد کی ضرورت محسوس ہوئی تو علامہ شبلی کی نظر اس ہونہار اور فاضل شاگرد پر پڑی، چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی کا باقاعدہ تقرر ہوا اور عربی زبان سکھانے کے لیے انہوں نے دو ابتدائی کتابیں ''دروس الادب'' کے نام سے ترتیب دیں، جس میں قرآن کی مختصر ترین آیات کو نحوی قواعد کے اثبات کے لیے بطور مثال ذکر کیا گیا ہے اور مبتدی طلباء کے ذہن کو براہ راست قرآن سے وابستہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، بایں طور کہ نحو و صرف کے مسائل بھی عملی طور پر سامنے آجائیں اور قرآن کی برکت بھی حاصل ہوجائے، دروس الادب کا پہلا جزء ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے اور مرفوعات، منصوبات اور مجرورات نیز ضروری نحوی قواعد کو صرف قرآنی مثالوں سے سمجھایا گیا ہے، جبکہ دوسرا جزء ۶۰ صفحات پر محیط ہے، جنوری ۱۹۰۹ء میں

الندوہ ہی کے لیے ''مکررات القرآن'' (یعنی قرآن مجید میں مکرر آیتیں کیوں ہیں؟) کے موضوع اور جولائی میں ''سود اور صحف انبیاء'' کے عنوان سے، نیز اگست ۱۹۱۱ء میں ''اسماء القرآن'' کے نام سے بیش قیمت مقالات تحریر فرمائے۔ یہ سید صاحبؒ کے ابتدائی دور کے مضامین ہیں، لیکن اپنی علمیت اور اثر پذیری میں استنادی درجہ رکھتے ہیں۔ جب وہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کے اصرار پر ''الہلال'' سے وابستہ ہوئے تو وہاں بھی قرآنی مضامین و مقالات سے الہلال کو گویا بدر کامل بنادیا، الہلال میں چونکہ مضمون نگار کے نام نہیں لکھے جاتے تھے، اس لیے بہت کم ہی مضامین کی شناخت ہو پائی، چند مضامین کے عناوین حسب ذیل ہیں:

۱۔ تذکار نزول القرآن الہلال ۶/ اگست ۱۹۱۳ء۔ ۲۔ قصص بنی اسرائیل ۲۴/ ستمبر اور ۱۲/ ۹/ ۱۹۱۳ء۔ ۳۔ علوم القرآن ۱۱/ فروری، ۲۵/ مارچ، ۸/ جولائی، ۔ ۴۔ اساطیر القرآن ۱۰/ ۲۲/ اپریل ۱۹۱۴ء۔

علامہ نے دوران قیام دکن کالج (پونہ) ایک یہودی عالم سے عبرانی اور انگریزی زبان با ضابطہ پڑھی اور عبور حاصل کیا اور یہیں سیرت عائشہ اور تاریخ ارض القرآن کا آغاز کیا، جو قرآنیات پر اپنی نوعیت کی گراں قدر کتابیں ہیں۔ جب دارالمصنّفین کے زیر اہتمام ''معارف'' نکالا تو پہلے ہی پرچہ میں ایک مضمون ''روزہ'' کے نام سے لکھا، جو ''**کتب علیکم الصیام**'' کی تفسیر ہے معارف کے پہلے شذرات کا آغاز ان الفاظ میں کیا:

> ''رسالہ معارف کا پہلا نمبر ہم رمضان المبارک ۱۲۲۴ھ کے مقدس مہینہ سے شروع کرتے ہیں کہ ہمارے تمام علوم و معارف کی سب سے پہلی کتاب یعنی قرآن اسی ماہ مقدس میں نازل ہوا تھا، شھر رمضان الذی أنزل فیہ القرآن''۔ (۳۳)

پھر معارف میں ان کے قرآنی مقالات و مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا، جو دوران قیام دارالمصنّفین جاری رہا ساتھ ہی معارف میں قرآن سے متعلق لکھے جانے والے دوسروں کے مضامین کو بھی نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ وہ جب بھی شذرات لکھتے تو قرآنی آیات کی ترجمانی براہ راست یا بالواسطہ ہوکر رہتی، ذیل میں شائع شدہ مضامین کے عناوین مع سنین ذکر کیے

جارہے ہیں:

۱-قرآن مجید پر تاریخی اعتراضات اگست وستمبر ۱۹۱۶ء۔ ۲-آیت استخلاف اکتوبر ۱۹۲۰ء۔ ۳-ارض حرم اور اس کے مصالح واحکام قرآن مجید کی نظر میں نومبر ودسمبر ۱۹۲۳ء۔ ۴-علوم القرآن اپریل ۱۹۲۶ء (الہلال میں شائع مضمون نظر ثانی کے بعد)۔ ۵-لفظ صلاۃ قرآن شریف میں اکتوبر ۱۹۲۷ء۔ ۶-ایام صیام پر نظر ثانی جنوری ۱۹۳۲ء۔ ۷-قرآن پاک کا تاریخی اعجاز فروری ۱۹۳۹ء۔ ۸-کیا قرآن رسول کا کلام اور انسانی تعلیمات سے ماخوذ ہے؟ اکتوبر ۱۹۴۰ء۔ ۹-وحی از روئے قرآن اور مدعی کا تضاد بیان نومبر ۱۹۴۰ء۔ ۱۰-وحی کی اقسام دسمبر ۱۹۴۰ء۔ ۱۱-حاکم حقیقی صرف اللہ ہے (یعنی ان الحکم الا للہ کی تفسیر) نومبر ۱۹۴۶ء مضامین ومقالات کے علاوہ سیرۃ النبی کی سوم تا ہفتم جلدیں، ارض القرآن اول ودوم میں منتشر جواہر پارے ان کی قرآن فہمی کی دلیل و برہان ہیں۔ وہ جس انداز سے قرآن کی خدمت کرنا چاہتے تھے، وہ انوکھا اور نرالا تھا، بعض وہ کام جو تکمیل کی منزل کو نہیں پہونچے، ان کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا محمد اویس ندوی تحریر فرماتے ہیں:

> ''سید صاحب کے ذہن میں عصری مذاق کے مطابق قرآن مجید کے مسائل کی ترتیب وتدوین کا ایک نقشہ تھا، وہ چاہتے تھے کہ اصول کی رعایت کرتے ہوئے دیانت اور ذہن کی سلامتی کے ساتھ آیات قرآنی پر غور کیا جائے اور ان آیات سے جن کلامی، فقہی، اخلاقی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کا استنباط ہوسکے ان کو احادیث نبویہ (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) نیز صحابہ وتابعین اور سلف صالحین کی تشریحات کے ساتھ الگ الگ مرتب کیا جائے''۔(۳۴)

علامہؒ نے ''عقائد القرآن'' اور ''فقہ القرآن'' کے نام سے عنوان مقرر کر کے کام بھی شروع کرایا تھا اور مولانا محمد اویس ندویؒ نے ''فقہ القرآن'' کے نام سے ایک بیاض بھی تیار کی تھی جو افسوس ہے کہ راقم کو تلاش بسیار کے بعد بھی نہیں ملی۔

علامہ صرف مصنف ومحقق ہی نہیں تھے، بلکہ کامل مربی تھے طالبین کو منزل تک پہنچانے کا گر اور سلیقہ رکھتے تھے، ان کے زیر اثر ایک نسل تربیت پا رہی تھی، اس وقت دارالمصنّفین کا پورا عملہ ان کی پُرفیض صحبتوں سے مستفیض ہو رہا تھا، انہوں نے علم دوست رفقاء رکھے اور ان کے ذوق کے

مطابق ان سے تحقیقی و علمی کام لیا، مولانا محمد اویس ندویؒ کا شروع میں بحیثیت رفیق، دارالمصنّفین سے کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن ان کی تربیتی نگاہ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مسند تدریس سے اٹھا کر دروس قرآنی اور تحقیقی کاموں کے ذریعہ ان کی ایسی تربیت کی کہ ان کے شاگردوں کے بقول ''ان کو قرآن کا چسکا لگ گیا تھا''، انہوں نے مولانا موصوف سے دوران قیام دارالمصنّفین علامہ ابن قیمؒ کے تفسیری افادات جمع کرائے جو ''التفسیر القیم'' کے نام سے ایک جلد میں شائع ہوئے۔ اسی طرح ابتدائی دور میں ابو مسلم خراسانی کے تفسیری اقوال علامہ رازیؒ کی ''التفسیر الکبیر'' سے منتخب کرا کے ''ملتقط من جامع التاویل ومحکم التنزیل'' کے نام سے شائع کرائے، دوسرے مفسرین کی طرح وہ اس بات کے قائل تھے کہ آیات قرآنی کی تشریح و توضیح احادیث نبویہ ہیں، اس لیے ان کی تجویز تھی کہ قرآن مجید اور احادیث نبویہ کا بنظر غائر مطالعہ کر کے، احادیث کو ان کے تحت جمع کیا جائے، اس کے لیے انہوں نے بقول مولانا اویس ندویؒ ''اپنی یادداشت کی کاپی میں دو عنوانات قائم فرمائے تھے''۔

پہلا عنوان یہ تھا **الآیات التی استدل بھا النبی ﷺ علی ما قالہ**، اس عنوان کے تحت انہوں نے ۵۸/ استدلالات نبوی کو جمع فرمایا، مثال کے طور پر ملاحظہ ہوں:

۱- فضل العالم علی العابد کفضلی علی أدنا کم، ثم تلا ''انما یخشیٰ اللہ من عبادہ العلماء'' (ترمذی تفسیر)

۲- فلما قضی الصلاۃ قال: من نسی الصلاۃ فلیصلھا اذا ذکرھا فان اللہ تعالی قال: أقم الصلاۃ لذکری (ابوداود، کتاب الصلاۃ)

۳- نھانا عن الاستخصاء ثم قرأ علینا یأیھا الذین آمنوا لا تحرموا طیبات ما أحل اللہ لکم ولا تعتدوا، إن اللہ لا یحب المعتدین (بخاری کتاب النکاح)

۴- إن اللہ یملی الظالم ثمّ قرأ: وکذلک أخذ ربک اذا أخذ القری وھی ظالمۃ (مسلم، کتاب البر والصلۃ)

دوسرا عنوان یہ ہے **القسم الثانی من الاحادیث التی تفسّر القرآن بغیر ذکر القرآن**، اس عنوان کے تحت انہوں نے ۲۸/ احادیث کو جمع فرمایا تھا، اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱- إیاکم والظن (مسلم) **إن بعض الظن اثم**

۲۔ إنما هي أعمالكم ترد عليكم　　وما تجزون الا ما كنتم تعملون

۳۔ أنفق ينفق عليك　　وما أنفقتم من شيئ فهو يخلفه"۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی نگرانی میں قرآنیات سے متعلق کچھ کام ابھی اشاعت کے منتظر ہیں، ان کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ دارالمصنّفین میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا ایک قلمی نسخہ ہے جس میں شاہ صاحب کے حواشی قرآن اور اصول ترجمہ قرآن نامی رسالہ بھی ہے۔ سید صاحبؒ کی خواہش تھی کہ شاہ صاحب کے ارشادات کو آیات قرآنی سے مدلل کیا جائے اور دوسرے محققین کی کتابوں سے اس کی توثیق کی جائے، اس سلسلہ میں تھوڑا سا کام ان کی حیات میں ہو چکا تھا۔ ۲۔ قرآن کریم پر ادبی حیثیت سے کام کرنے والوں کی سہولت کی غرض سے انہوں نے ان تمام آیات کو سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے جمع کرا دیا تھا، جن سے معانی و بلاغت نیز دوسرے فنون کی کتابوں کے مسائل کی تشریح کے ضمن میں قرآن مجید کے لطائف ادبیہ کی وضاحت کی گئی ہے۔ ۳۔ قرآن نے جن چیزوں کو بطور آیات ذکر کیا ہے انہیں متعلقہ آیات اور قدیم و جدید ماخذ سے ایسے معلومات کے ساتھ جمع کر دیا جائے جن سے ان کے آیات خداوندی ہونے کی حقیقت کی وضاحت ہو جائے، ان آیات کو جمع کیا جا چکا ہے، تشریح کا کام باقی ہے۔ ۴۔ اعجاز قرآنی پر مسلمانوں کے عہد تصنیف سے لے کر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو سنین کی ترتیب کے لحاظ سے سید صاحب نے جمع کرایا تھا۔ یہ مجموعہ ایک جلد میں تیار ہوا۔ (۳۵)

قرآن اور تجدد پسند مسلمان: علامہ سید سلیمان ندویؒ نے وقتاً فوقتاً قرآن کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کا صرف جواب ہی نہیں دیا، بلکہ ان کے "کارشر" کو موقوف کر کے چھوڑا، نیاز فتح پوری ایڈیٹر ماہنامہ "نگار" نے جب مستشرقین کے راگ اور سُر میں اپنے افکار و خیالات کی ترجمانی کی تو ابتداءً علامہ نے "گلہ آشنا" نام سے ایک مضمون سپرد قلم کیا، جس سے مسلمانوں میں "نیازیت" سے شدید بیزاری ظاہر ہوئی، اور ایسی صدائے احتجاج بلند کی گئی، جس سے نیاز کو توبہ نامہ شائع کرتے ہی بن پڑی، لیکن چند سال کے بعد جب انہوں نے توبہ توڑ کر ملحدانہ خیالات کی اشاعت پھر شروع کر دی اور قرآن کو الہامی کتاب ماننے سے انکار کیا، تو ان نیازی ہفوات سے مسلمانوں میں بڑا ہیجان پیدا ہوا، ان کی غیرت ایمانی متحرک ہوئی۔ سید صاحب نے معارف کے اکتوبر، نومبر اور دسمبر ۱۹۴۰ء کی

تین مسلسل اشاعتوں میں بالترتیب ''کیا قرآن رسول کا کلام اور انسانی تعلیمات سے ماخوذ ہے؟ ''وحی از روئے قرآن اور مدعی کا تضاد بیان اور وحی کے اقسام'' کے نام سے مضامین لکھ کر ان کا مدلل جواب دیا، ایک جگہ لکھا: ''ہماری سعادتوں وہدایتوں کے سب سے قیمتی خزانہ کا نام قرآن پاک ہے، جس پر بہ اختلاف فرق تمام مسلمانوں کا اتفاق تام اور اجماع عام تھا اور ہے کہ یہ انسانی وخیالی قصص وحکایات سے بلند تر اللہ کی طرف سے آئی ہوئی صداقت کا نام ہے اور اسی سے وہ ہر خطا سے پاک اور ہر غلطی سے مبرا ہے، اس لیے ہر وہ ہاتھ جو اس کی عصمت کو داغدار بنانے کی کوشش کرے گا اس کا ہاتھ کاٹ ڈالنا ہمارا فرض ہے''۔(۳۶)

چنانچہ یہ فتنہ دب گیا، لیکن چند سال کے بعد نیاز کی الحادو بے دینی کی تبلیغ واشاعت پھر شروع ہوئی، بالفاظ دیگر گڑے مردے اکھاڑ کر ۱۹۴۵ء میں ایک اور شگوفہ چھوڑا گیا جس میں ایک انگریز مشنری کلیر ڈبلو ٹسڈل (Dr.Clair W Tisdall) کی کتاب کو بنیاد بنا کر اسلامی تعلیمات کی تردید کا سلسلہ شروع کیا اور اپنے مزعومات ظاہر کر کے علماء سے جواب مانگا، جس پر متعدد علماء نے مضامین ومقالات لکھے، لیکن علامہ ندویؒ کے شذرات اور شاہ معین الدین صاحب ندویؒ کا مقالہ ''فہم قرآن کے اصول وشرائط'' ایسے موثر ثابت ہوئے، جس سے یہ فتنہ ختم ہوگیا۔ نیاز پاکستان سدھار گئے، پاکستان میں ''نگار'' جاری رہا لیکن بقول محمد اقبال انصاری: ''ملحدانہ خیالات اپنے سینے ہی میں دفن کر لینے پڑے''۔(۳۷)

غیر معمولی مقبولیت: علامہ سید سلیمان ندویؒ کی علمی مقبولیت کا آفتاب، نصف النہار پر تھا، زمانہ ان کی قرآن فہمی اور علم آفرینی کی داد دے رہا تھا اور پوری قوم ان کی قرآنی نکتہ سنجیوں کی عاشق وشیدا تھی کہ اچانک ایک صاحب جن کا نام جناب امداد صابری ہے(۳۸)، انہوں نے علامہ کی قرآنی غلطیوں کی تلاش شروع کی اور ایک رسالہ مرتب کر دیا۔

نومبر ۱۹۳۶ء میں جب سید صاحبؒ فلسطین کانفرنس کی صدارت کی غرض سے دہلی تشریف لے گئے تو اس کا ذکر سنا، چنانچہ انہوں نے اس رسالہ کو سرسری طور پر دیکھا اور معارف دسمبر ۱۹۳۶ء میں اس کا مدلل جواب دیا، بقول مالک رام ''آپ نے گیارہ غلطیوں کے اس رائی کے پہاڑ کی دھجیاں اڑا دیں جس پر برافروختہ ہو کر صابری صاحب نے ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر دیا، مگر نواب سائل

دہلوی نے درمیان میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کرا دیا''۔(۳۹) سید صاحب نے اس رسالہ پر اپنے تاثر کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

مجھے اس موقع پر دو خوشیاں حاصل ہوئیں، ایک تو یہ کہ میری تصانیف کے ہزاروں اوراق میں بحمداللہ کہ قرآن پاک کی چند ہی غلطیاں ہیں، دوسری یہ کہ مصنف رسالہ اور ایک دو بریلویوں کو چھوڑ کر ان اکابر علماء نے ان کو صرف ''مسامحات'' قرار دیا، تکفیر و الحاد کا فتویٰ نہیں دیا ع

برین مژدہ گرجاں فشانم رواست

اور یہ مسامحات بھی بیشتر وہی ہیں، جو جامعہ وغیرہ میں پہلے دکھائے جا چکے ہیں، میں بھی اور دلی کے علماء اور ثقات بھی یہ خوب جانتے ہیں، کہ اوراق کے اصلی مصنف کون ہیں، ع

سر این رشتہ زجائے است کہ نمی دانم

ان صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس فریب و سازش سے محافظین حدیث و سنت کو خود ان کے ہم مذہبوں کے ہاتھوں سے قتل نہیں کرایا جا سکتا، اتنی کاوشوں کے بعد بھی جو مواد فراہم کیا گیا ہے، اس کا ماحصل یہ ہے کہ میرے گیارہ اغلاط میں سے دو چھاپنے کی غلطیاں ہیں، جن میں سے ایک کا اعلان حافظ اسلم صاحب جیراج پوری کی تنقید کے جواب میں دو سال ہوئے کہ اسی معارف میں کیا جا چکا ہے کہ میں نے ''قطّ'' کا ترجمہ چھٹی نہیں بلکہ چٹھی کیا ہے اور دوسری یہ ہے کہ عربوں کی جہاز رانی میں ایک کے بجائے ''ہر ایک'' پڑھیے، جیسا کہ نفس آیت کے ترجمہ میں ہے۔ ارض القرآن میں دو اور خطبات میں جس ایک اہم غلطی پر صفحے کے صفحے رنگے گئے ہیں وہ معترض کی قلت تدبر کا نتیجہ ہیں، بقیہ چھ غلطیاں یہ ہیں کہ مباحث برزخ میں اہل قرآن کے مقابلہ میں میں نے اقوال مفسرین سے الگ ان آیتوں کے محل سمجھے ہیں، یعنی جو آیتیں قیامت سے متعلق ہیں، وہ برزخ پر چسپاں کر دی ہیں اور جو پل صراط کے موقع پر لکھی جانی چاہئے تھی، وہ بہشت کے موقع پر لکھ دی ہے، اگر اقوال مفسرین سے اتنا بھی اختلاف الحاد ہے، تو مفتی کو تنہا غریب سید سلیمان کے نہیں بلکہ بڑے بڑے علماء کے الحاد کا فتویٰ دینا ہوگا۔

مسئلہ عدم خلود نار پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کی بناء پر اگر یہ ہنگامہ ہے، تو پہلے یہ ہنگامہ بعض مشاہیر صحابہؓ بعض تابعینؒ اور مفسرین کے اور خصوصیت سے امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے

خلاف برپا کرنا چاہیے، حافظ ابن قیم نے ''حادی الارواح'' اور ''شفاء العلیل'' میں اس پر ۲۵ دلیلیں قائم کی ہیں اور ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ اہل سنت کے ایک گروہ کا یہ مسلک ہے، سید سلیمان کا سوائے اس کے کوئی قصور نہیں کہ اس نے حافظ ابن قیم کے خیالات کی ترجمانی اردو میں کر دی ہے، جن لوگوں کو اس مسلک سے اختلاف ہے ان کو سید سلیمان کے بجائے بعض صحابہؓ، بعض تابعین، بعض مفسرین اور ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے خلاف زور آزمائی کرنی چاہیے۔

بہر حال یہ سب تو غالب کے مقطع کی سخن گسترانہ باتیں تھیں، اب میں رسالہ کے اصلی و نقلی دونوں مصنفوں کو اگر وہ نیک نیت ہیں، تو بشارت اور اگر وہ اس سے محروم ہیں تو یہ پر حسرت پیام سناتا ہوں کہ ان قرآنی غلطیوں کی تصحیح کئی سال پہلے دوسرے ایڈیشن میں کر دی گئی ہے، کچھ کی اب کر دی گئی ہے اور پہلے ایڈیشن کے جو نسخے اسٹاک میں ہیں ان میں بھی تصحیح کر دی گئی ہے اور مسئلہ نار میں جمہور کا مسلک صاحب رسالہ سے زیادہ مدلل ہے اس میں پہلے ہی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ **واستغفر اللہ ربی من کل ذنب و سوء عقیدۃ فی الدین**۔(۴۰)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ اسی رسالہ کے رد میں رقم طراز ہیں:

''سید صاحب نے سیرت اور ارض القرآن میں قرآنی آیات کے سمجھنے میں جو غلطیاں کی ہیں وہ بقول ان کے ''صرف پڑھنے والوں کے اسلامی عقائد پر مضر اثر ڈالتی ہیں'' لیکن کیا وہ ان مصنّفین سے بے خبر ہیں، جن کی غلطیوں کی اگر انھوں نے جلد خبر نہ لی تو اندیشہ ہے کہ تمام اسلامی عقائد کی دھجیاں اڑا دیں گی (**لا سمح اللہ**)، سید صاحب بیشک ''قرآنی آیات کے سمجھنے میں غلطیاں کر جاتے ہیں'' لیکن ایک معصوم وجود کے سوا (روحنا فداہ) اس آسمان کے نیچے کون ہے جس نے قرآنی آیات کے سمجھنے میں غلطیاں نہیں کی ہیں، آپ ایک آیت کی تفسیر کرتے ہیں اور اس کی تائید میں تفسیروں کے نام لکھ دیتے ہیں، کیا یہ تمام تفسیریں مسامحات سے پاک ہیں، اور ان کے مصنّفین معصوم تھے؟ اگر ایسا نہیں ہے اور آپ بھی تسلیم کریں گے کہ ایسا نہیں ہے تو پھر بحث و نظر کی کوئی دوسری راہ اختیار کیجیے۔

حیرت کا مقام ہے کہ جب ہمارے مجتہدین عصر امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کا مذاق اڑاتے ہیں، اسلامی عقائد اور مذہبی اصول پر تیشے چلاتے ہیں، ابو ہریرہؓ اور ابو ذر غفاریؓ کی تحقیر کرتے ہیں، حدیث و فقہ کو دفتر اساطیر قرار دیتے ہیں تو اس سات کروڑ کی اسلامی آبادی میں صرف ایک شخص کا قلم

ہے جو اسلام کا قلم ہے جو اسلام کی حجت اور مذہب کی برہان بن کر نمودار ہوتا ہے، وہ کون؟ ''مولانا سید سلیمان ندوی''۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بھی صدق لکھنؤ یکم فروری ۷ ۱۹۳ء میں ایک مبسوط مقالہ ان اعتراضات کے جواب میں تحریر کیا۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے جنوری ۱۹۴۳ء کے معارف کے شذرات میں اپنی تحریری عمر کے چالیس سال مکمل ہونے پر ''رجوع واعتراف'' کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس سے مذکور مسئلہ کو سمجھنے میں مزید تقویت حاصل ہوگی، ذیل میں اس کا ایک اقتباس نقل کیا جارہا ہے:

''مذہبی مسائل کی تحقیقات میں میرا یہ عمل رہا ہے کہ عقائد میں سلف صالحین رحمہم اللہ کے مسلک سے علاحدگی نہ ہو، البتہ فقہیات میں کسی ایک مجتہد کی تقلید بتمامہ نہیں ہوسکی ہے، بلکہ اپنی بساط بھر دلائل کی تنقید کے بعد فقہاء کے کسی ایک مسلک کو ترجیح دی ہے، لیکن کبھی کوئی ایسی رائے اختیار نہیں کی، جس کی تائید ائمہ حق میں سے کسی ایک نے بھی نہ کی ہو، خصوصیت کے ساتھ مسائل کی تشریح میں حافظ ابن تیمیہؒ، حافظ ابن قیمؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تحقیقات پر اکثر اعتماد کیا ہے، ایسا بھی دو چار دفعہ ہوا ہے کہ ایک تحقیق کے بعد دوسری تحقیق سامنے آئی ہے تو بعد کے ایڈیشن میں اس کے مطابق تبدیلی کردی ہے مثلاً معراج بحالت بیداری و بجسم ہونے پر قرآن پاک سے صحیح استدلال مجھے پہلے نہیں مل سکا اور بعد کو اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی توفیق سے صحیح دلیل سمجھادی تو دوسرے ایڈیشن میں اس کو بڑھا کر مقام کی تصحیح کردی، اسی طرح فنائے نار کے مسئلہ میں پہلے حافظ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کی پیروی میں جو کچھ لکھا گیا بعد کو جمہور کی رائے کا اضافہ کر کے دونوں کے دلائل کی تشریح کردی ہے اور اب بحمداللہ کہ اس باب میں جمہور ہی کے مسلک کا حق ہونا سمجھ میں آ گیا ہے، وماتوفیقی الا باللہ۔

علمائے سلف میں اپنی رائے سے رجوع اور قول ثانی کا رواج عام رہا ہے، یہ ان ہی کا اتباع حق ہے، والحق أحق أن یتبع، یہ باتیں کسی معترض کے خوف سے

نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے لکھ رہا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ بارالہا! مجھے صراط مستقیم پر قائم رکھ"۔

حواشی

(۱) مکاتیب شبلی ج/ ۱۷۔۳۱۔ (۲) ایضاً۔ (۳) علامہ شبلی کی قرآن فہمی ص ۱۱۔ ۱۴۔ (۴) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص ۴۳۔ (۵) مشاہیر کے خطوط بنام سید سلیمان ندوی ص ۹۸۔ (۶) علم کا مقام اور اہل علم کی ذمہ داریاں ص ۷۔ (۷) پرانے چراغ ۲/ ۵۸ اور دعوت فکر و عمل ۱۰۸۔ (۸) مجلہ ذکر و فکر نئی دہلی میں مضمون: قرآن اور فہم سلیمان، ماہ شوال ۱۴۰۹ھ، و ماہ جون ۱۹۸۹ء۔ (۹) مکتوبات سلیمانی ج ۱/ ۵۸۔ (۱۰) مکاتیب سلیمان ۱۱۵۔ (۱۱) حوالہ مذکور ۱۸۔ (۱۲) قرآنی افادات ص ۱۷۲۔ (۱۳) نکات سورۂ فاتحہ مرتبہ مولانا محمد اویس ندوی۔ (۱۴) سیرۃ النبی ج ۴/ ۴۵۔ (۱۵) مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف ج ۱/ ۷۔ (۱۶) مجلہ ذکر و فکر ص ۶۱۔ (۱۷) حوالہ مذکور۔ (۱۸) افکار سلیمانی ص ۳۶، مضمون بعنوان علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی بصیرت۔ (۱۹) روح البیان ج ۱/ ۴۰۵۔ (۲۰) ترجمۂ قرآن مولانا احمد علی لاہوری ص ۱۲۔ (۲۱) مجلہ ذکر و فکر ۱۹۸۹ء۔ (۲۲) سیرۃ النبی ج ۳/ ۲۴۶۔ (۲۲) مجلہ ذکر و فکر ۱۹۸۹ء۔ (۲۳) سیرۃ النبی ج ۳/ ۲۷۱۔ (۲۴) نکات سورۂ فاتحہ مرتبہ مولانا محمد اویس ندوی۔ (۲۵) پندرہ روزہ تعمیر حیات ندوۃ العلماء، ۲۵ اپریل ۲۰۰۵ء۔ (۲۶) سیرۃ النبی ج ۵/ ۳۷۔ (۲۷) تذکرۂ سلیمان ص ۲۲۴۔ (۲۸) مطالعہ سلیمان ص ۳۷۔ (۲۹) تعمیر حیات ۱۹۶۴ء۔ (۳۰) تعمیر حیات ۱۹۶۴ء۔ (۳۱) مطالعہ سلیمان ص ۶۴۔ (۳۲) شذرات سلیمانی ج ۱/ ۱۔ (۳۳) معارف سلیمانؒ نمبر ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ (۳۴) معارف سلیمان نمبر ۱۹۷۲۔ ۱۹۷۳۔ (۳۵) معارف ۱۹۴۰ء۔ (۳۶) مطالعہ سلیمانی ص ۷۰۔ (۳۷) مولانا امداد صابری دہلی کے صحافی اور اخبار نویس تھے، ولادت اکتوبر ۱۹۱۴ء ذی قعدہ ۱۳۳۳ء میں ہوئی، ساری زندگی صحافت اور سیاست سے وابستہ رہے، ان کا انتقال دہلی میں جمعرات ۱۳/ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو ہوا۔ کاروان رفتہ: مولانا اسیر ادروی ص ۴۵۔ (۳۸) مالک رام مضمون بعنوان علامہ سید سلیمان ندوی، معارف سلیمان نمبر مئی وجون ۱۹۵۵ء۔ ص ۳۵۶۔ (۳۹) شذرات سلیمانی ج ۳/ ص ۱۲۴۔ ۱۲۶۔ (۴۰) مجلہ الاصلاح: شعبان ۱۳۵۵، مطابق نومبر ۱۹۳۶ء۔

امام ابوالحسن کرخی کا اصول اور غلط فہمیوں کا جواب

مولانا عبید اختر رحمانی

امام ابوالحسن الکرخی (متوفی ۳۴۰) فقہ حنفی کے معتبر ائمہ میں سے اور امام طحاوی کے ہم عصر ہیں، امام کرخی کے شاگردوں میں بڑے باکمال اور نامور فقہاء ہوئے ہیں، جن میں سے ایک امام جصاص بھی ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ وہ نہایت زاہد و عابد بھی تھے، کئی مرتبہ ان کے علمی مرتبہ ومقام کی وجہ سے عہدہ قضا پیش کیا گیا؛ لیکن انہوں نے باوجود تنگ دستی و احتیاج کے عہدہ قضا کے قبول کرنے سے انکار کردیا، صرف اسی پر بس نہیں بلکہ ان کے شاگردوں میں جو بھی قضاء کا عہدہ قبول کرتا، اس سے تعلقات منقطع کر لیتے تھے، آخر عمر میں جب فالج کا حملہ ہوا اور ان کے شاگردوں نے ان کی تنگ دستی اور علاج کی گرانی کو دیکھ کر سیف الدولہ ابن حمدان کو خط لکھ کر ان کے حال سے واقف کرایا تو سیف الدولہ نے ان کے لیے دس ہزار درہم بھیجے، شاگردوں کی اس کارروائی کا ان کو کسی طرح علم ہوگیا، انہوں نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی کہ اے اللہ اس رقم کے مجھ تک پہنچنے سے پہلے تو مجھ کو اپنے پاس بلالے، ایسا ہی ہوا، سیف الدولہ کی رقم پہنچنے سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

قواعد فقہ میں انہوں نے مختصر طور پر ایک کتاب لکھی ہے، جس میں فقہ کے چند بنیادی قاعدے بیان کیے گئے ہیں، اس میں انہوں نے ایک دو باتیں ایسی ذکر کی ہیں جن سے بظاہر لگتا ہے کہ قرآن وحدیث پر ائمہ کے اقوال کو ترجیح دی جارہی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے اور جو مطلب ہے، وہ پوری طرح قابل قبول اور عقل وفہم میں آنے والا اور قرآن وحدیث کے معارض نہیں

نگراں شعبہ تحقیق، المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد۔

بلکہ موافق ہے۔امام ابوالحسن الکرخی کے متنازع اقوال یہ ہیں:

ان کل آیتہ تخالف قول اصحابنا فانھا تحمل علی النسخ او علی الترجیح والاولی ان تحمل علی التاویل من جھة التوفیق۔ (اصول البزدوی ویلیہ اصول الکرخی ص ۳۷۴)	ہر وہ آیت جو ہمارے اصحاب کے قول کے خلاف ہوگی تو اس کو نسخ پر محمول کیا جائے گا یا ترجیح پر محمول کیا جائے گا اور بہتر یہ ہے کہ ان دونوں میں تاویل کر کے تطبیق کی صورت پیدا کی جائے۔
ان کل خبریجی بخلاف قول اصحابنا فانہ یحمل علی النسخ او علی انہ معارض بمثلہ ثم صار الی دلیل آخر او ترجیح فیہ بما یحتج بہ اصحابنا من وجوہ الترجیح او یحمل علی التوفیق، وانما یفعل ذلک علی حسب قیام الدلیل فان قامت دلالة النسخ یحمل علیہ وان قامت الدلالة علی غیرہ صرنا الیہ۔ (اصول البزدوی ویلیہ اصول الکرخی ص ۳۷۴)	ہر وہ خبر جو ہمارے اصحاب کے قول کے خلاف ہوگی تو وہ نسخ پر محمول کی جائے گی، یا وہ اسی کے مثل دوسری حدیث کے معارض ہوگی تو پھر کسی دوسری دلیل سے کام لیا جائے گا یا جس حدیث سے ہمارے اصحاب نے استدلال کیا ہے اس میں وجوہ ترجیح میں سے کوئی ایک ترجیح کی وجہ ہوگی یا پھر دونوں حدیث میں تطبیق وتوفیق کا راستہ اختیار کیا جائے گا اور یہ دلیل کے لحاظ سے ہوگا۔اگر دلیل معارض حدیث کے نسخ کی ہے تو نسخ پر محمول کیا جائے گا یا اس کے علاوہ کسی دوسری صورت پر دلیل ملتی ہے تو وہی بات اختیار کی جائے گی۔

یہی وہ عبارت ہے جس کی حقیقت سمجھے بغیر اعتراضات کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا اور اس میں پیش پیش ایسے حضرات بھی ہیں جن کا علم سرسری اور ثانوی مآخذ تک محدود ہے۔اپنے علم وفہم پر اعتبار کر کے وہ یہی سمجھتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے سمجھا ہے وہی حرف آخر ہے اور کوئی دوسرا نقطہ نظر قابل قبول ہی نہیں ہے۔امام کرخی کے قول کا مطلب کیا ہے اس کا جواب کئی اعتبار سے دیا جا سکتا ہے:

۱۔کسی بھی قول کا بہتر مطلب قائل یا قائل کے شاگردوں کی زبانی سمجھنا بہتر ہوتا ہے کیونکہ وہ قائل کے مراد اور منشاء سے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ واقف ہوتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ جو بات

کہی گئی ہے یا لکھی گئی ہے، اس میں کیا مطلق اور کیا مقید ہے، کون سی بات ہے جو بظاہر تو مطلق ہے لیکن درحقیقت وہ مقید ہے، اسی وجہ سے شاہ ولی اللہ دہلوی نے ائمہ اربعہ کی اتباع اور پیروی کو واجب کہا ہے اور دیگر مجتہدین کی پیروی سے منع کیا ہے۔ (دیکھیے **عقد الجيد في احكام الاجتهاد و التقليد**، ص ۱۳، المولف (الشاہ ولی اللہ الدہلوی) الناشر: المطبعة السلفية القاهرة)

امام کرخی کے شاگردوں کے شاگرد ابوحفص عمر بن محمد النسفی ہیں، امام نسفی کا شمار فقہ حنفی کے ممتاز فقہاء اور متبحر علماء میں ہے ان کا انتقال ۵۳۷ھ میں ہوا، انہوں نے اصول کرخی کے متعدد قواعد کی تشریح اور توضیح کی ہے، پہلے اصول کی تشریح میں امام نسفی لکھتے ہیں:

قال (النسفی) من مسائله ان من تحری عند الاشتباه واستدبر الكعبة جاز عندنا لان تاويل قوله تعالىٰ فولوا وجوهكم شطره اذا علمتم به والى حيث وقع تحريكم عند الاشتباه او يحمل على النسخ كقوله تعالىٰ و لرسوله ولذى القربى فى الآية ثبوت سهم ذوى القربى فى الغنيمة ونحن نقول انتسخ ذلك باجماع الصحابه رضى اللّٰه عنه او على الترجيح كقوله تعالىٰ والذين يتوفون منكم ويذرون ازواجا ظاهر يقتضى ان الحامل المتوفى عنها زوجها لا تنقضى عدتها بوضع الحمل قبل مضى اربعة اشهر وعشرة ايام لان الآية عامة فى كل متوفى عنها زوجها

اس کے مسائل میں سے یہ ہے کہ جس پر قبلہ مشتبہ ہوجائے اور وہ غور وفکر کے بعد ایک سمت اختیار کر لے تو ہمارے نزدیک اس کی نماز جائز ہے (اگرچہ اس نے قبلہ کے علاوہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھی ہو) کیونکہ ہمارے نزدیک اللہ تعالیٰ کے قول کی تاویل فولوا وجوهكم شطره کی یہ ہے کہ جب تم اس کے بارے میں واقف رہو اور اشتباہ کی صورت میں غور وفکر کے بعد جو سمت اختیار کرو، یا وہ نسخ پر محمول ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ولرسوله ولذى القربى الخ آیت میں رشتہ داروں کے لیے بھی غنیمت کے مال میں حصہ کا ثبوت ہے اور ہم کہتے ہیں کہ یہ صحابہ کرام کے اجماع سے منسوخ ہے۔ ترجیح پر محمول کرنے کی صورت یہ ہے کہ آیت پاک والذين يتوفون منكم ويذرون ازواجا کا ظاہری تقاضا یہ ہے کہ حاملہ عورت کا شوہر مرجائے تو اس کی عدت وضع حمل سے نہیں ہوگی بلکہ اس کو

حاملا او غيرها وقوله تعالىٰ اولات الاحمال اجلهن ان يضعن حملهن يقتضى انقضاء العدة بوضع الحمل قبل مضى الاشهر لانها عامة فى المتوفى عنها زوجها وغيرها لكنا رجعنا هذه الآية بقول ابن عباس رضى الله عنهما انها نزلت بعد نزول تلك الآية فنسختها وعلى رضى الله تعالىٰ عنه جمع بين الاجلين احتياطا لاشتباه التاريخ۔ (اصول البزدوى ويليه اصول الكرخى ص ۳۷۴)

چار ماہ دس دن عدت کے گزارنے ہوں گے کیونکہ آیت ہر ایک عورت کے بارے میں عام ہے خواہ وہ حاملہ ہو یا غیر حاملہ ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ کا دوسرا ارشاد ہے کہ حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ حاملہ عورت کے وضع حمل کے بعد عدت ختم ہوجائے گی خواہ چار ماہ دس دن پورے نہ ہوئے ہوں۔ یہ آیت عام خواہ حاملہ عورت کا شوہر مرا ہو یا نہ مرا ہو لیکن اس آیت کو ہم نے اس لیے ترجیح دی کیونکہ حضرت ابن عباسؓ کا قول موجود ہے کہ یہ آیت پہلی آیت **والذين يتوفون منكم** کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اس سے پہلی آیت منسوخ ہوگئی ہے اور حضرت علیؓ نے دونوں قول میں احتیاط کی بنا پر جمع کی صورت اختیار کی ہے۔

دوسرے اصول کی تشریح میں امام نسفی لکھتے ہیں:

قال من ذلك ان الشافعى يقول بجواز اداء سنة الفجر بعد اداء فرض الفجر قبل طلوع الشمس لماروى عن عيسى رانى رسول الله صلى الله عليه وسلم اصلى ركعتين بعد الفجر فقال ما هما فقلت ركعتا الفجر كنت الم اركعهما فسكت قلت هذا منسوخ بما روى عن النبى صلى الله عليه وسلم انه قال لا صلوة بعد الفجر حتى تطلع الشمس

اس کی شرح یہ ہے کہ امام شافعی طلوع شمس سے پہلے فجر کی فرض نماز کی ادائیگی کے بعد فجر کی سنت پڑھنے کو جائز قرار دیتے ہیں ان کی دلیل عیسیٰ سے منقول وہ حدیث ہے کہ رسول پاکؐ نے مجھ کو فجر کے بعد دو رکعت پڑھتے دیکھا انھوں نے پوچھا یہ تم کیا پڑھ رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ فجر کی دو سنت رکعتیں جس کو میں نہیں پڑھ سکا آپؐ نے یہ سن کر سکوت اختیار فرمایا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ نبی پاکؐ کے اس ارشاد سے منسوخ ہے کہ فجر کے بعد کوئی نماز نہ

و لا بعد العصر حتی تغرب الشمس والمعارضة فکحدیث انس رضی اللہ تعالیٰ عنه انه کان یقنت فی الفجر حتی فارق الدنیا فهو معارض بروایة عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنه ان النبی صلی اللہ علیه وسلم قنت شهراثم ترکه فاذا تعارضا روایتاه تساقطا فبقی لنا حدیث ابن مسعود وغیره رضی اللہ تعالیٰ عنه ان النبی صلی اللہ علیه وسلم قنت شهرین یدعو علی احیاء العرب ثم ترکه واما التاویل فهو ما روی عن النبی صلی اللہ علیه وسلم انه کان اذا رفع راسه من الرکوع قال سمع اللہ لمن حمده ربنا لک الحمد وهذا دلالة الجمع بین الذکرین من الامام وغیره ثم روی عن النبی ﷺ انه قال اذاقال الامام سمع اللہ لمن حمده قولوا ربنا لک الحمد و القسمة تقطع الشرکة فیوفق بینهما فنقول الجمع للمنفرد والافراد للامام والمتقدی و عن ابی حنیفة انه یقول الجمع للمتنفل والافراد للمفترض

(المصدر السابق)

پڑھی جائے تاوقتیکہ سورج طلوع ہوجائے اور عصر کے بعد کوئی نماز نہ پڑھی جائے تاوقتیکہ سورج غروب ہوجائے۔ معارضہ کی صورت یہ ہے کہ حضرت انس کی حدیث ہے کہ آپ فجر کی نماز میں قنوت پڑھتے رہے اور اسی معمول پر دنیا سے رخصت ہوئے۔ یہ حدیث حضرت انس کی دوسری حدیث کے معارض ہے کہ آپؐ نے ایک مہینہ فجر کی نماز میں قنوت پڑھا پھر اس کو چھوڑ دیا۔ یہ دونوں روایتیں ایک دوسرے کے معارض ہونے کی بناء پر ساقط ہوگئیں ہم نے اس کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث پر عمل کیا کہ آپؐ نے دو مہینہ فجر کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھی جس میں عرب کے بعض قبیلوں کے لیے بددعا کی گئی پھر اس کو آپؐ نے ترک فرما دیا۔ اور تاویل کی صورت یہ ہے کہ نبی پاکؐ سے منقول ہے کہ آپ جب رکوع سے اپنا سر اٹھاتے تو سمع اللہ لمن حمدہ ربنا لک الحمد کہتے تھے۔ یہ دونوں ذکر کو جمع کرنے کی دلیل ہے۔ پھر آپؐ سے یہ بھی منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم ربنا لک الحمد کہا کرو تقسیم، شرکت کے منافی ہے۔ تو ان دونوں حدیث میں تطبیق اس تاویل کے ذریعہ دی جائے گی کہ دونوں ذکر سمع اللہ لمن حمدہ اور ربنا لک الحمد کہنے کی صورت منفرد کے لیے ہے اور تقسیم اس صورت میں ہے جب

باجماعت نماز ہورہی ہو۔ امام ابوحنیفہؒ سے منقول
ہے کہ جمع نفل نماز پڑھنے والے کے لیے ہے اور
اِفراد فرض نماز پڑھنے والے کے لیے ہے۔

امام کرخی کے قاعدے کی امام نسفی کی وضاحت کی روشنی میں اتنی بات واضح ہوگئی ہے کہ

۱۔ اس قول کا ظاہری مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر کوئی قرآن کی آیت ہو یا کوئی حدیث ہو تو اس کے مقابل میں صرف امام ابوحنیفہؒ کا قول کافی ہوگا۔

۲۔ یہ بھی واضح ہوگیا کہ امام کرخی کا صحیح منشاء یہ ہے کہ ائمہ احناف نے اگر قرآن پاک کی کسی آیت پر عمل کو ترک کیا ہے یا کسی حدیث کو قابل عمل نہیں مانا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے قرآن اور حدیث پر اپنے امام کے قول کو ترجیح دی ہے، بلکہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر ائمہ احناف کا کوئی قول بظاہر قرآن یا حدیث کے خلاف نظر آتا ہے، تو اس میں ان ائمہ کرام سے یہ حسن ظن رکھنا چاہیے کہ ان کی نگاہ میں قرآن کی یہ آیت منسوخ یا تاویل کے قابل ہوگی اور اسی بنیاد پر انہوں نے اس آیت کو مسئلہ کی بنیاد نہیں بنایا ہے۔

۳۔ ائمہ احناف نے کسی مسئلہ میں جس پہلو کو اختیار کیا ہے اس کے لیے بھی ان کے پاس قرآن وحدیث سے دلائل موجود ہیں اور انہوں نے قرآن کی کسی آیت پر ترک عمل اسی وقت کیا ہے جب ان کے سامنے قرآن ہی کا دوسرا حکم موجود تھا۔

یہ وہ بات ہے جس کو ماننے میں کسی بھی معقول اور منصف مزاج شخص کو تامل نہ ہوگا۔

۲۔ امام کرخی کی یہ بات کہ ائمہ احناف نے اگر آیت یا حدیث کو چھوڑا ہے تو اس لیے کہ یا تو وہ ان کی رائے میں منسوخ ہے، یا اس کے معارض کوئی دوسری حدیث ہے یا پھر وہ حدیث اپنے ظاہر پر محمول نہیں ہے۔ وہ اپنی جگہ بالکل درست ہے اور یہی بات ہر دور میں علماء اعلام نے ائمہ کرام کی جانب سے کی ہیں۔ چاہے وہ ابن تیمیہ ہوں یا پھر حضرت شاہ ولی اللہ۔

امام ابن تیمیہ نے ایک کتاب لکھی ہے **رفع الملام عن ائمة الاعلام**۔ اس میں وہ ائمہ کرام کے کسی حدیث یا نص قرآنی کی مخالفت کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الاسباب التي دعت العلماء إلى مخالفة وہ اسباب جن کی وجہ سے علماء نے بعض نصوص کی

بعض النصوص وجميع الاعذار ثلا ثـة أصناف: أحدها: عدم اعتقاده أن النبي ﷺ قاله والثاني: عدم اعتقاده إرادة تلك المسألة ذلك القول والثالث اعتقاده أن ذلك الحكم منسوخ وهذه الأصناف الثلاثة تتفرع إلى أسباب متعددة۔ (رفع الملام عن ائمة الاعلام،ص ۱۲)

مخالفت کی، تمام اعذار تین قسم کے ہیں، ایک تو یہ کہ ان کو یقین نہ ہو کہ رسول پاک ﷺ نے ایسا کہا ہوگا، دوسرے یہ کہ ان کا یقین نہ ہو کہ رسول پاک نے اس قول سے وہی بات مراد لی ہوگی ۔ تیسرے ان کا یقین کہ وہ حکم منسوخ ہے۔

اس کے بعد ابن تیمیہ نے ان تینوں اعذار کی شرح کی ہے اور شرح میں وہ لکھتے ہیں:

"السبب التاسع: اعتقاده أن الحديث معارض بما يدل على ضعفه أو نسخه أو تأويله إن كان قابلا للتأويل بما يصلح أن يكون معارضا بالاتفاق مثل آية أو حديث آخر أو مثل إجماع"۔(ایضاً،ص ۳۰)

اس قول کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد انصاف یہی ہے کہ امام کرخی کے بیان میں اور امام ابن تیمیہ کے بیان میں یک گونہ مطابقت ہے۔کوئی فرق نہیں اور اگر کچھ فرق ہے تو صرف اسلوب اور طرز ادا کا، امام کرخی کا اسلوب بیان منفی ہے یعنی ہر وہ آیت یا حدیث جو ہمارے اصحاب کے قول کے مخالف ہو، جب کہ ابن تیمیہ کا بیان مثبت ہے یعنی اگر کسی امام نے کسی حدیث پر عمل ترک کیا ہے تو اس کی وجہ اس کا منسوخ ہونا، کسی دوسرے حدیث کے معارض ہونا وغیرہ ہے۔

۳۔امام کرخی کے بیان کردہ قاعدہ کا ایک اور مطلب ہے، امام کرخی نے اپنے بیان میں "ہمارے اصحاب" کا ذکر کیا ہے، امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا نام خاص طور پر نہیں لیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہے یا نادر الوقوع ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، امام محمد، امام زفر اور اسی طرح ائمہ متقدمین میں سے اور کچھ لوگ تمام کے تمام کسی ایسے قول کے قائل ہوں جس پر قرآن وحدیث کی کوئی دلیل نہ ہو، عموماً ایسا ہوا ہے کہ ائمہ احناف کے درمیان متعدد مسائل میں اختلاف رہا ہے جو دلائل کی بنیاد پر ہوا، وقف کے مسئلہ میں صاحبین نے امام ابوحنیفہ سے اختلاف کیا ہے، قرأت خلف الامام کے مسئلہ میں امام محمد، امام مالک اور امام احمد بن حنبل کی رائے کے قائل ہیں کہ جہری نمازوں میں نہ

پڑھی جائے اور سری نمازوں میں پڑھی جائے۔

اب اگر ایسے میں تمام ائمہ احناف نے کسی آیت پر عمل نہ کیا ہو یا کسی حدیث کو ترک کر دیا ہو تو اس کی وجہ وہی ہو سکتی ہے جو امام کرخی بیان کر چکے ہیں۔ اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ عناد و تعصب کی تو اس میں گنجائش ہی نہیں۔

امام کرخی کے مذکورہ اصول کے اس مطلب کے قریب حضرت شاہ ولی اللہ کا بھی قول ہے۔ وہ فیوض الحرمین میں لکھتے ہیں:

عرضنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان فی المذھب الحنفی طریقة انیقة ھی اوفق الطرق بالسنة المعروفة التی جمعت ونقحت فی زمان البخاری واصحابه وذلک ان یوخذ من اقوال الثلاثة قول اقبلھم بھا فی المسئلة ثم بعد ذلک یتبع اختیارات الفقھاء الحنفین الذی علماء الحدیث (فیوض الحرمین، ص ۶۴)

حضورؐ نے مجھ کو بتایا کہ مذہب حنفی میں ایک ایسا بہترین طریقہ ہے جو تمام طرق میں سب سے زیادہ ان احادیث کے موافق ہے جن کی تدوین و تنقیح امام بخاری اور ان کے اصحاب کے دور میں ہوئی اور وہ طریقہ یہ ہے کہ علماء ثلاثہ (یعنی امام صاحب اور صاحبین) کے اقوال میں سے جس کا قول حدیث کے معنی سے زیادہ قریب ہو اسے اختیار کیا جائے۔ پھر اس کے بعد ان حنفی فقہاء کے اختیارات پر عمل کیا جائے جو محدث بھی تھے۔

ایک اور جگہ حضرت شاہ ولی اللہ اسی کتاب فیوض الحرمین (ص ۶۳) میں لکھتے ہیں:

''پھر فقہ حنفی کے ساتھ احادیث کو تطبیق دینے کا ایک نمونہ وصورت مجھ پر منکشف کیا گیا اور بتایا گیا کہ علماء ثلاثہ (امام ابوحنیفہ وصاحبین) میں سے کسی ایک کے قول کو لے لیا جائے، ان کے عام اقوال کو خاص قرار دیا جائے، ان کے مقاصد سے واقف ہوا جائے اور بغیر زیادہ تاویل سے کام لیے احادیث کے ظاہری الفاظ کا جو مطلب سمجھ میں آتا ہو اس پر اکتفاء کیا جائے۔ نہ تو احادیث کو ایک دوسرے سے ٹکرایا جائے اور نہ ہی کسی حدیث صحیح کو امت کے کسی فرد کے قول کے پیش نظر ترک کیا جائے''۔

یہ قابل لحاظ ہے کہ دونوں مقام پر حضرت شاہ ولی اللہ ائمہ ثلاثہ ہی کا ذکر کرتے ہیں کہ ان کے اقوال سے باہر نہ نکلا جائے، یعنی بالواسطہ طور پر حضرت شاہ ولی اللہؒ یہ بات کہہ رہے ہیں کہ ائمہ ثلاثہ میں سے تینوں کسی ایسے قول پر متفق ہوجائیں جس پر قرآن وحدیث کی کوئی دلیل نہ ہو، ایسا نہیں ہوسکتا بلکہ ان میں سے کسی ایک کا قول قرآن وحدیث کی تائید سے متصف ہوگا۔

امام کرخی کے قول پر غور کریں، وہ بھی بالواسطہ طور پر یہی کہہ رہے ہیں لیکن کچھ لوگوں کی نظر میں ان کے طرز تعبیر نے ان کو ملامت کا نشانہ بنا دیا۔

۴۔کبھی ایسا ہوتا ہے اور بہت ہوا ہے کہ بات صحیح ہوتی ہے لیکن غلط طرز تعبیر سے بات کچھ کی کچھ ہوجاتی ہے اگر طرز اور تعبیر کو درست کر دیا جائے تو وہی بات درست اور صحیح معلوم ہوتی ہے۔

حضرت معاویہ کے گورنر ابن غیلان نے ایک مرتبہ کسی شخص کے دوران خطبہ کنکر پھینکنے پر ہاتھ کاٹ دیا تھا۔ کچھ لوگوں نے ابن غیلان سے لکھوایا کہ تم کہہ دینا کہ میں نے شبہہ کی وجہ سے ہاتھ کاٹ دیا ہے پھر اس تحریر کو لے جا کر حضرت معاویہ کو دکھایا اور فریادی ہوئے کہ ہمارے ساتھ انصاف کیجیے۔ حضرت معاویہ نے اس موقع پر جو جملہ کہا وہ یہ ہے کہ ”میں ہاتھ کی دیت بیت المال سے ادا کردوں گا لیکن ہمارے عمال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں ہے“۔(البدایۃ والنہایۃ، المولف: ابوالفد ا اسماعیل بن عمر بن کثیر القرشی البصر ی ثم الدمشقی (المتوفی ۷۷۴ھ)، الناشر: داراحیاء التراث العربی، الطبعۃ الاولی ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء، ص ۸/ ۷۷)

یہ جملہ کہ ہمارے عمال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں ہے. بہت غلط فہمی پیدا کرنے والا جملہ ہے اور اس سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ عمال اور گورنر قانون سے بالاتر ہیں اور شاید مولانا مودودی کی خلافت وملوکیت میں عمال اور گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دینے کا الزام کا سبب یہی ہو لیکن مسئلہ کی صحیح صورت حال یہ ہے کہ اگر شبہ کی وجہ سے حاکم کسی شخص پر کوئی حد جاری کردے تو پھر اس حاکم سے قصاص نہیں لیا جاسکتا، کیونکہ اگر ایسی صورت میں حاکم پر حد جاری کی جائے تو پھر کوئی بھی نہ تو حاکم بننے پر راضی ہوگا اور نہ کسی معاملہ میں حد وقصاص جاری کرے گا، کیا پتہ کس معاملے میں اس سے غلطی ہوجائے اور اس کے مواخذہ میں اس کا ہاتھ پیر کاٹا جائے، لیکن حاکم کو تعزیر کی جاسکتی ہے، سزا دی جاسکتی ہے، مالی جرمانہ عائد کیا جاسکتا ہے، عہدہ سے معزول کیا جاسکتا ہے، خود حضرت معاویہ

نے ابن غیلان کو اسی وجہ سے معزول کر دیا تھا، اس وضاحت کی روشنی میں اگر سابقہ جملہ کہ ''ہمارے عمال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں ہے'' کو پڑھا جائے تو کوئی اشکال نہیں پیدا ہوتا، لیکن اگر یہ وضاحت نہ ہوتو واقعتاً وہی شبہ پیدا ہوتا ہے جو مولانا مودودی کو پیش آیا۔

حقیقت یہ ہے کہ احناف نے بسا اوقات ایسا طرز اپنی کتابوں میں اختیار کیا ہے جس سے کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہوگئی اور کچھ لوگ جو پہلے سے احناف سے برگشتہ خاطر تھے، انہوں نے عبارت پر غور کیے اور حسن ظن رکھے بغیر زبان طعن و تشنیع دراز کی۔

مثلاً احناف کا ایک اصول ہے کہ کوئی آیت جب عام ہوتو اس کی خبر واحد سے تخصیص نہیں ہوسکتی، اس موقع پر ایسا اسلوب اختیار کیا گیا جس سے یہ سمجھا گیا کہ احناف کے نزدیک خبر واحد کی کوئی اہمیت نہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ احناف کے نزدیک قرآن کی آیت جب عام ہو تو خبر واحد سے تخصیص درجہ فرض میں نہیں ہوسکتی درجہ وجوب میں ہوسکتی ہے، اس کی بہتر وضاحت علامہ انور شاہ کشمیری نے فیض الباری کے مقدمہ میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ان النص اذا جاء ساکتا عن شیء وجاء الخبر یثبته فهل تجوز تلک الزیادة و تزاد به علی القاطع ،فماذکره ساداتنا العظام رحمهم الله تعالیٰ انها لا تجوز لانها فی معنی النسخ وهو لا یجوز من خبر الواحد ومن اجل تلک المقالة شنع علیهم بعض المحدثین فانهم فهموا ان امامنا الهمام لا یبالی بخبر النبی صلی الله علیه وسلم مبالاة ولا یهم بالاعمال هما وهذا کماتری یبنی علی صورة التعبر فقط فلذا غیرت عنوانهم من السلب الی الایجاب وکم من	جب نص کسی مسئلہ سے خاموش ہو اور خبر واحد اس کا اثبات کر رہی ہو تو کیا اس خبر واحد کے ذریعہ نص پر اضافہ معتبر ہوگا اور اس کے ذریعہ نص قطعی پر اضافہ کیا جاسکے گا۔ ہمارے فقہاء نے ذکر کیا ہے کہ خبر واحد کے ذریعہ نص پر اضافہ کرنا درست نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ نسخ کے معنی میں ہوجائے گا اور یہ خبر واحد کے ذریعہ جائز نہیں ہے اور اسی وجہ سے بعض محدثین نے احناف پر تشنیع کی ہے۔ ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ ہمارے امام صاحب رسول پاکؐ کے فرمودات کو اہمیت نہیں دیتے اور نہ ہی اعمال کو ایمان کے لیے ضروری سمجھتے ہیں اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں یہ کہ سب اسلوب بیان اور تعبیر کی وجہ سے ہوا ہے۔ اسی

مواضع فعلت فيما مثل صنيعي في هذا المقام غيرت العنوان وبقيت المسالة على حالها فاني اجد كثيرا من اعتراضاتهم علينا من هذاالقبيل فاذا غير العنوان اندفعت وطاحت وهذا كما قيل: والحق قد يعتريه سوء تعبير و بعض الاعتراضات تبنى على سوء الفهم وفرط التعصب وهذا ايضا من باب: "كم من عائب قولاصحيحا وآفته من الفهم السقيم" فاقول مغيرا كلامهم ان خبر الواحد تجوز منه الزيادة لكن في مرتبه النقل فلايزاد به على القاطع ركنا او شرطا فما ثبت من القاطع يكون ركنا او شرطاً وما ثبت من الخبر يكون واجبا اور مستحبا حسب اقتضاء المقام وليس هذا من باب التغير في المسالة بل من باب التصرف في التعبير فان الزيادة عندهم في مرتبة الركنية والشرطية هي التي تسمى زيادة اصطلاحا واما في مرتبة الوجوب والاستحباب فلا يسمونها زيادة فحينئذ معنى قولهم لا تجوز الزيادة اى في مرتبة الركنية والشرطيه۔

لیے میں نے اس عنوان کو منفی سے مثبت کر دیا ہے اور دیگر مقامات پر بھی یہی عمل دوہرایا ہے۔ اس مقام پر میں نے صرف عنوان بدلا ہے۔ نفس مسئلہ سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے وہ اپنی جگہ برقرار ہے میں نے پایا ہے کہ ہم پر محدثین کے بہت سارے اعتراضات اسی قبیل سے ہیں۔ لہٰذا جب تعبیر بدل دی جائے تو ان کے تمام اعتراضات ختم ہوجاتے ہیں اور ہوا میں اڑ جاتے ہیں۔ اور ویسا ہی ہے جیسا کہ کہا گیا ہے۔ کبھی کبھار بری تعبیر کی وجہ سے حق بات بری معلوم ہونے لگتی ہے۔ ہاں بعض اعتراضات محدثین کے یا احناف پر اعتراض کرنے والوں کے سوء فہم اور تعصب کی وجہ سے ہیں۔ تو میں ان کی بات کو بدل کر کہتا ہوں کہ خبر واحد سے اضافہ درست ہے لیکن گمان کے مرتبہ میں۔ تو اب خبر واحد کے ذریعہ نص قطعی پر کسی رکن اور شرط کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا جو مسئلہ یا جو بات نص قطعی سے ثابت ہوگی تو وہ رکن اور شرط کے درجہ میں ہوگی اور جو چیز خبر واحد سے ثابت ہوگی تو وہ تقاضائے کلام کے مطابق واجب یا مستحب ہوگی۔ میری یہ بات مسئلہ میں ردوبدل نہیں ہے بلکہ صرف تعبیر میں فرق ہے۔ فقہائے احناف کے نزدیک اضافہ اس کو کہتے ہیں جو رکن اور شرط کے درجہ میں ہو اس سے کمتر درجہ میں (وجوب یا استحباب) اگر کوئی اضافہ ہو رہا ہے تو وہ اس کو اصطلاحی

طور پر اضافہ نہیں مانتے ۔تو اب ان کے قول کا
مطلب کہ خبرواحد کے ذریعہ نص پر اضافہ درست
نہیں ہے یہ ہوا کہ رکنیت اور شرط کے مرتبہ میں اضافہ
درست نہیں ہے۔

ہمارا ابھی یہی کہنا ہے کہ حضرت امام کرخی کی بات کو آپ منفی سے مثبت کر دیجیے کہ:

''ہمارے اصحاب نے اگر کسی آیت پر عمل کو ترک کیا ہے تو اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ یا تو وہ آیت منسوخ ہوگی یا پھر اس کے ظاہری طور پر معارض دوسری آیت پر عمل کیا گیا ہوگا اور اس کے لیے ان کے پاس وجہ ترجیح ہوگی ،بہتر یہ ہے کہ دونوں آیتوں میں تطبیق کی صورت اختیار کی جائے''۔

''ہر وہ حدیث جس پر ہمارے اصحاب نے عمل نہیں کیا یا اس کو ترک کیا ہے تو اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ یا تو وہ حدیث منسوخ ہوگی یا اس کے معارض دوسری حدیث پر انھوں نے عمل کیا ہوگا جس کے ترجیح کے دلائل ان کے پاس ہوں گے یا پھر دونوں حدیث میں تاویل کر کے تطبیق اور توفیق کی صورت پیدا کی جائے''۔

یعنی نفس مسئلہ میں کوئی تغیر نہیں کیا گیا صرف تعبیر اور اظہار کا فرق ہے۔

امام کرخی کے قول کے مطلب کی پوری وضاحت ہوگئی ہے، جو غلط فہمی کی وجہ سے معترض ہیں تو ان کی غلط فہمیوں کے ازالہ کی صورت بھی واضح ہوگئی۔البتہ وہ اعتراض جس کی تہہ میں تعصب و عناد ہو، اس کا کوئی جواب دینا بہت مشکل ہے۔

۵۔اس تمام قیل وقال کے باوجود اگر امام کرخی کی بات غلط اور نادرست ہے تو بھی ایسا نہیں ہے کہ امام کرخی کے اس قول کا کوئی بہتر عذر نہ تلاش کیا جاسکے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی خاص لمحے میں کچھ ایسی باتیں کہہ گزرتا ہے جو عام حالات میں ناگفتہ بہ کہی جاسکتی ہیں لیکن جاننے والے اس کے عذر کو سمجھ لیتے ہیں اور قائل پر طعن و تشنیع نہیں کرتے ،اس کی کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

امام ابن معین کوفی ہیں اور انہیں امام وکیع سے انتہائی عقیدت ہے، عقیدت کے جوش میں

وہ یہاں تک کہہ گئے:

عباس وابن أبي خيثمة سمعا يحيى يقول: من فضل عبد الرحمن بن مهدي على وكيع، فعليه لعنة الله والملامكة والناس أجمعين ـ (سير اعلام النبلاء ترجمه وكيع بن الجراح) (سير أعلام النبلاء ٧/ ٥٦٦، المولف: شمس الدين أبو عبد الله الذهبي، الناشر: دار الحديث- القاهرة)

جوکوئی عبدالرحمن مہدی کو وکیع پر ترجیح دے اس پر اللہ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔

ظاہر ہے کہ امام وکیع کی فضیلت پر نہ کوئی حدیث موجود ہے اور نہ کوئی آیت اور نہ ہی مسلمانوں کا اجماع لیکن جوش عقیدت میں حضرت یحیی بن معین ایسی بات کہہ گئے۔

امام ابن معین کی اس بات پر حافظ ذہبی نے بھی نقد کیا ہے لیکن ادب واحترام کے ساتھ، چنانچہ حافظ ذہبی اس قول پر نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قلت: هذا كلام ردي فغفر اللّٰه ليحيى، فالذي أعتقده أنا أن عبد الرحمن أعلم الرجلين وأفضل وأتقن (سير أعلام النبلاء ٧/ ٥٦٦، المولف: شمس الدين أبو عبد الله الذهبي، الناشر: دار الحديث- القاهرة)

میں (ذہبی) کہتا ہوں، یہ بری بات ہے، اللہ یحییٰ بن معین کی مغفرت کرے، میرا اعتقاد یہ ہے کہ عبدالرحمٰن بن مہدی وکیع سے بڑے عالم، ان سے افضل اور پختہ کار محدث تھے۔

دوسری مثال:

قال أبو يحيى الناقد: كنا عند إبراهيم بن عرعرة فذكروا يعلى بن عاصم فقال رجل: أحمد بن حنبل يضعفه فقال رجل

ابویحییٰ الناقد کہتے ہیں کہ ہم ابراہیم بن عرعرۃ کے پاس تھے انہوں نے یعلی بن عاصم کا ذکر کیا تو ایک شخص نے کہا کہ ان کو امام احمد بن حنبل نے ضعیف

وما يضره إذا كان ثقة؟ فقال ابن عرعرة: والله لو تكلم أحمد في علقمة والأسود لضرهما (سير أعلام النبلاء، ۱۱/۲۰۲، المؤلف: شمس الدين أبو عبدالله الذهبي، الناشر: دار الحديث-القاهرة)	قرار دیا ہے۔تو دوسرے شخص نے کہا کہ اس سے اس کو کیا نقصان ہوسکتا ہے جب کہ وہ ثقہ ہو۔اس پر ابن عرعرہ نے کہا کہ خدا کی قسم اگر احمد؛ علقمہ اور اسود کے بارے میں بھی کلام کرتے تو ان دونوں کو نقصان پہنچتا۔

خوب معلوم ہے کہ حضرت علقمہ اور حضرت اسود کس پایہ و مرتبہ کے شخص ہیں، اگر ان پر حضرت امام احمد بن حنبل کلام کرتے تو وہ تو مجروح نہ ہوتے البتہ ممکن تھا کہ خود امام صاحب کی شخصیت پر داغ سا آجاتا، جیسا کہ حافظ ذہبی نے الرواۃ الثقات المتکلم فیہ میں حضرت ابن معین کے امام شافعی پر جرح کرنے پر لکھا ہے کہ اس سے وہ تو مجروح نہ ہوئے بلکہ خود ابن معین کو عیب اور دھبہ لگا ہے۔ (**الرواة الثقات المتكلم فيهم بما لا يوجب ردهم**، ص ۲۹، المولف: شمس الدین الذہبی، الناشر: دارالبشائر اسلامیۃ-بیروت لبنان)

مقصود یہی ہے کہ ابن عرعرہ، حضرت امام احمد بن حنبل کی تعریف میں مبالغہ کررہے ہیں لیکن اس کی وجہ سے ابن عرعرہ پر تنقید یا ان کو لعن طعن کرنا مناسب نہیں بلکہ صرف اتنا ہونا چاہیے کہ احساس ظاہر کردیا جائے۔ایک اور مثال:

محمد بن يحيى النيسابوري، حين بلغه وفاة أحمد، يقول: ينبغي لكل أهل دار ببغداد أن يقيموا عليه النياحة في دورهم. (سیر اعلام النبلاء، ۱۱/ ۲۰۳، المولف: شمس الدین ابوعبداللہ الذہبی، الناشر: دارالحدیث-القاہرۃ)	جب محمد بن یحیی نیشاپوری کو حضرت امام احمد بن حنبل کے وفات کی خبر ملی تو کہا کہ بغداد والوں کو چاہیے کہ وہ اپنے گھروں میں نوحہ کریں۔

ظاہر ہے کہ رونا پیٹنا اور نوحہ کرنا اسلام میں غیر شرعی اور ممنوع فعل ہے۔بعض روایتوں میں اس کو کفر کی باقیات سے تعبیر کیا گیا ہے (الکتاب المصنف فی الاحادیث والآثار، المولف: ابوبکر بن ابی شیبۃ، الناشر: مکتبۃ الرشد الریاض، ۳/۶۰)

اس کے باوجود ایک عظیم القدر محدث امام احمد کے انتقال پر لوگوں کو نوحہ کرنے کا حکم دے رہا ہے۔ لیکن جذبات کی شدت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان پر ویسی تنقید نظر نہیں آتی جس کو امام کرخی کے لیے روا رکھا گیا۔

حافظ ذہبی اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **قلت: تكلم الذهلي بمقتضى الحزن لا بمقتضى الشرع** (المصدر السابق). میں کہتا ہوں کہ ذہلی کی یہ بات غم واندوہ کے تقاضا کے موافق ہے۔ یہ مقتضائے شریعت بہر حال نہیں ہے۔ یہ بھی ملاحظہ ہو کہ:

وقال آخر: نظرة عندنا من أحمد تعدل عبادة سنة (المصدر السابق)	ایک شخص نے کہا کہ ہمارے نزدیک امام احمد کی طرف ایک نگاہ دیکھنا ایک سال کی عبادت کے برابر ہے۔
قلت: هذا غلوٌ لا ينبغي، لكن الباعث له حب ولي الله في الله.	میں (ذہبی) کہتا ہوں کہ یہ نامناسب غلو ہے لیکن اس کا باعث اللہ کے ولی کی محبت ہے۔ (المصدر السابق)

ایک اور مثال:

قال أحمد بن سنان: سمعت عبد الرحمٰن بن مهدي يقول: لو كان لي عليه سلطان على من يقرأ قراءة حمزة- لأوجعت ظهره وبطنه. (سیر اعلام النبلاء ترجمہ عبدالرحمٰن بن مہدی)	عبدالرحمن بن مہدی کہتے ہیں کہ اگر مجھ کو اقتدار ہوتا تو جو شخص بھی حمزہ کی قرات پر قرآن پاک پڑھتا ہے اس کی پٹائی کرتا۔

آج امت مسلمہ کا بڑا طبقہ بلکہ اگر اس کو ۹۵ فیصد بھی کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ حمزہ کی قرات پر ہی قران پاک کی تلاوت کرتا ہے اور اسی کو اللہ پاک نے قبول عام بخشا ہے۔ ابن مہدی حمزہ کی قرات کے سلسلہ میں کتنی سخت بات کہتے ہیں۔

ان تمام مثالوں سے یہ بتانا ہے کہ محبت یا نفرت میں کچھ ایسی باتیں سرزد ہو جاتی ہیں جن کو حدود سے متجاوز سمجھا جا سکتا ہے لیکن اس کی وجہ سے معین، عبدالرحمٰن بن مہدی، ابن عرعرہ اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں پر طعن وتشنیع شروع کر دیں، جیسا کہ کچھ لوگوں نے امام کرخی کے متعلق اس طرز کو اپنایا ہے، یہ مناسب ہے یا یہ کہ ان اقوال کی بہتر تاویل کی جائے اور قائلین سے حسن ظن رکھا جائے،

ایسے لوگوں پر سوائے افسوس کے کیا کیا جائے جو ایک کی لغزش کے لیے تاویل کا سہارا لیتے ہیں اور دوسرے کی خطا پر اس کے درپے ہوجاتے ہیں۔

۶-اجتہادی غلطی: حق یہ ہے کہ اصول فقہ، نفس فقہ ہو یا حدیث کی صحت وعدم صحت ہو اور روایتوں پر جرح وتعدیل اور کلام ہو۔ خطا کے امکان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تو کیا یہ انصاف ہے کہ اپنے ممدوح کے لیے اجتہادی غلطی اور دوسرے کے لیے مطلق غلطی کی بات کی جائے۔

۷-ہر مسلک میں یہ عام بات ہے کہ بعض علماء اپنے شاذ نظریات کے ساتھ نظر آتے ہیں، تاہم ان کی وجہ سے پورے مسلک پر تنقید کرنا درست نہیں کہا جاسکتا۔ خصوصاً جب کہ اس مسلک سے وابستہ دیگر فقہاء نے اس کی تائید نہ کی ہو۔

یہ ستم ظریفی ہے کہ امام کرخی کے ایک اصول کی آڑ میں ان کے پورے مکتب فکر کو مورد الزام قرار دیا جائے لیکن اپنے معاملہ میں اجتہادی غلطی کہہ کر درگزر سے کام لیا جائے۔ وغیر ذلک۔

بہرحال امام کرخی کے مذکورہ قول کی دیگر ائمہ احناف نے کبھی تائید نہیں کی ہے بلکہ سرے سے اس کو ذکر کے لائق ہی نہیں سمجھا۔ امام بزدوی کی ''اصول البزدوی'' ہو، جصاص رازی کی ''الفصول فی اصول الفقہ''، امام سرخسی کی ''اصول السرخی''، امام سمرقندی کی ''میزان الاصول فی نتائج العقول فی اصول الفقہ''، ابن ہمام کی ''التحریر''، ملا محب اللہ بہاری کی ''سلم''، اس کی شرح ''مسلم الثبوت''، ''اصول شاشی'' اور ''نور الانوار''، فقہ حنفی کی کسی کتاب میں امام کرخی کے اس اصول کا ذکر نہیں ملتا۔

تذکرۃ الفقہا (اول) (جدید)

مولانا عمیر الصدیق ندوی

صفحات: ۲۴۳　　قیمت: ۱۵۰/ روپے

کتاب نورس، مرتبہ پروفیسر نذیر احمد
ایک تجزیاتی مطالعہ

جناب عقیل احمد

کلاسیکی متون کو جدید اصول ترتیب کے مطابق جن علمائے محققین نے مرتب و مدون کیا ہے، ان میں ایک نام پروفیسر نذیر احمد (متوفی ۲۰۰۸ء) کا بھی ہے۔ ادبیات فارسی کے علاوہ وہ ماہرِ غالبیات، کتبہ شناس، فرہنگ ساز اور دکنی ادب کے ماہر کی حیثیت سے بھی مشہور ہوئے۔

ان کی تحقیق کا دائرۂ کار تو فارسی ادبیات سے متعلق ہے لیکن انہوں نے دکنی ادب پر بھی توجہ کی اور متعدد فن پارے دریافت کیے اور ترتیب و تدوین کے بعد ان کو شائع بھی کیا۔ ان میں کتاب نورس اور پرت نامہ قابل ذکر ہیں۔ زیر نظر مضمون کتاب ''نورس'' سے متعلق ہے۔

کتاب نورس، ابراہیم عادل شاہ کے ۵۹ گیتوں اور ۱۷ دوہروں کا مجموعہ ہے، جس کے متعدد ہم عصر نسخے پروفیسر صاحب نے جمع کیے اور ان کی روشنی میں ایک مستند و مکمل متن مع ترجمہ تیار کر کے مقدمہ، حواشی اور فرہنگ کے ساتھ ۱۹۵۵ء میں سرفراز قومی پریس (لکھنؤ) سے شائع کرایا۔

آغاز کتاب میں ۲۰ صفحات پر مشتمل، مرتب نے ایک تعارف تحریر کیا ہے، جس میں تدوین سے قبل پیش آنے والے مراحل، مثلاً نسخوں کی حصولیابی کی کوشش، اس سلسلہ میں دیگر اہل علم اشخاص سے خط و کتابت اور اسفار وغیرہ کا ذکر کیا ہے نیز نسخوں کی نوعیت، نقائص اور بے ترتیبی، موضوع اور زبان کی دشواری وغیرہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب نورس کی ترتیب و تدوین کا کام کتنا مشکل اور دشوار گزار تھا۔

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

تعارف کے بعد ایک طویل تحقیقی اور علمی مقدمہ ہے جو (ص ۷ سے ص ۶۳ تک) ۵۴ صفحات پر مشتمل ہے۔اس مقدمہ میں درج ذیل عنوانات قائم کیے گئے ہیں:

۱۔مصنّف، ۲۔کتاب نورس، ۳۔کتاب کا عنوان، ۴۔تاریخ تصنیف، ۵۔دیباچہ، ۶۔ترجمہ، ۷۔کتاب نورس کی زبان، ۸۔کتاب نورس کی ادبی اہمیت، ۹۔نسخوں کی کیفیت پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

مقدمہ کے آغاز میں پروفیسر صاحب نے عادل شاہ ثانی کا مختصراً مگر جامع تعارف کرایا ہے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کو کم عمری ہی میں بادشاہت مل گئی تھی، وہ فطری طور پر قابل اور ذہین تھا۔فنون لطیفہ سے کافی دلچسپی تھی، اس کے عہد میں بیجاپور کی ادبی و علمی ترقی ہوئی، بادشاہ کی سرپرستی میں اس کے درباری علما و فضلا نے مختلف علوم و فنون پر متعدد کتابیں تصنیف کیں، تاریخ سے بھی دلچسپی تھی، فارسی زبان پر قدرت حاصل تھی، موسیقی سے رغبت تھی، شاعری کا دلدادہ تھا، موزوں طبیعت کا مالک تھا، بلند درجہ کا ناقد تھا، خوش نویسی سے بھی شغف تھا، دکنی زبان کے ساتھ ساتھ سنسکرت، برج بھاشا اور ہندو دیومالا پر عبور حاصل تھا اور لفظ نورس سے الفت تھی۔

کتاب نورس: یہ علم موسیقی سے متعلق ایک مختصر کتاب دکنی نظم میں ہے۔اس میں راگ یا راگنی کو عنوان قرار دے کر اس کے تحت بادشاہ کے گیت درج کر دیے گئے ہیں۔ یہ ۱۷ راگوں کے ذیل میں کل ۵۹ گیت اور ۱۷ دوہے ہیں۔ ہر راگ کے تحت جوابیات ہیں وہ کبھی دو مصرعوں پر کہیں تین یا چار مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ تین مصرعوں کا استعمال عام طور پر ہوا ہے۔ مرتب متن نے ان گیتوں کو موضوع کے اعتبار سے مندرجہ ذیل چار حصوں میں منقسم کیا ہے:

۱۔اکثر گیتوں میں ہندو دیومالا کی تلمیحات پائی جاتی ہیں مثلاً شیو، پاربتی، سرستی، گنیش، اندر وغیرہ۔ ۲۔ایسے بھی گیت پائے جاتے ہیں جن میں حضرت گیسودراز سے پرخلوص عقیدت مندی کا اظہار کیا گیا ہے۔ ۳۔کچھ گیت ایسے بھی ہیں جن میں عادل شاہ کی خانگی زندگی کا عکس ملتا ہے۔ ۴۔کتاب نورس کا معتدبہ حصہ ایسے گیتوں پر مشتمل ہے جو عاشقانہ مضامین کے حامل ہیں۔

کتاب کا عنوان: مرتب کے مطابق اس مجموعہ کو عام طور پر نورس سے یاد کیا گیا ہے، لیکن وہ اس سے متفق نہیں۔ان کی تحقیق یہ ہے کہ کتاب کا پورا نام ''کتاب نورس'' ہے، دلیل کے لیے مرتب نے ظہوری کی (سہ نثر سے اور ملک قمی کی کلیات ملک قمی سے ایک ایک اقتباس بھی بطور حوالہ پیش کیا

ہے، ان دونوں اقتباسات میں اس تصنیف کو ’’کتاب نورس‘‘ سے ہی مخاطب کیا گیا ہے۔

تاریخ تصنیف: مرتب نے کتاب نورس کا زمانۂ تصنیف متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور داخلی و خارجی شواہد کی روشنی میں اس کا زمانۂ تصنیف ۱۰۰۴ھ اور ۱۰۰۸ھ کے درمیان بتایا ہے اور تصنیف کے وقت بادشاہ کی عمر ۳۰ سال کے قریب بتائی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ’’کتاب مذکور میں چاند سلطان کا ذکر اس طرح ہوا ہے گویا وہ بقید حیات ہے۔ چاند بی بی کو چاند سلطان کا لقب ۱۰۰۴ھ کے وسط میں ملا تھا۔ اس کا قتل دوسری اردلی بہشت ۱۰۰۸ھ کو عمل میں آیا۔ اگرچہ اکبرنامہ میں ۱۰۰۹ھ کے ضمن میں چاند سلطان کے قتل کا واقعہ مندرج ہے لیکن یہ غلط ہے کیونکہ اردلی بہشت ذی قعدہ کی آخری تاریخوں میں پڑا تھا اور اس ہجری مہینہ کا سنہ ۱۰۰۸ھ ہی تھا۔ اس اعتبار سے کتاب کی تصنیف ۱۰۰۴ ہجری کے بعد اور ۱۰۰۸ ہجری سے قبل ثابت ہوتی ہے۔ ظہوریؔ نے کتاب مذکور کا دیباچہ لکھا جو غالباً کتاب کی تکمیل کے وقت لکھا گیا ہوگا۔ چونکہ ظہوریؔ کا ورود بیجاپور ۱۰۰۴ھ کے قبل ثابت نہیں ہوسکتا اس لیے کتاب نورس کی تکمیل ۱۰۰۴ھ اور ۱۰۰۸ھ کے درمیان ہوئی ہوگی‘‘۔ (کتاب نورس، مرتبہ نذیر احمد، لکھنؤ، طبع اول ۱۹۵۵ء، مقدمہ ص ۱۹)

دیباچہ: ایک دیباچہ کتاب نورس کے لیے ظہوریؔ نے ابراہیم عادل شاہ کے ایما پر تحریر کیا تھا جو زبان و بیان کے لحاظ سے منفرد و ممتاز تھا۔ یہ دیباچہ اگرچہ شامل کتاب نہیں ہے لیکن مرتب نے اپنے مقدمہ میں اس پر تحقیقی گفتگو کرکے اس کے تمام نکات کو واضح کردیا ہے۔

ایک دیباچہ کتاب نورس کے لیے ملک قمی نے بھی تحریر کیا تھا پروفیسر نذیر احمد کے مطابق جب ظہوری کا دیباچہ اس کے مخصوص انداز تحریر کی وجہ سے مشہور ہوا اور لوگوں نے خیال کیا کہ ملک اس طرح کی نثر لکھنے پر قادر نہیں ہے تو اسی جذبہ رشک نے ملک کو بھی دیباچہ نورس لکھنے پر مجبور کیا۔

بہرحال ملک اور ظہوری دونوں نے کتاب نورس کے دیباچے لکھے۔ دونوں کے دیباچے فارسی میں ہیں۔ پروفیسر صاحب تحریر کرتے ہیں:

> ’’ظہوری کا دیباچہ مقدم ہے اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ اس کو اصل کتاب

کے ساتھ شامل ہونے کا موقع ملا ہوگا ممکن ہے بعد کے نسخوں میں دونوں شامل ہوئے ہوں ..... بہ ظاہر کچھ زمانہ گذرنے کے بعد دیباچہ اصل کتاب سے الگ ہوگیا اور اس کی مقبولیت کے سامنے ابراہیم عادل شاہ کا چراغ نہ جل سکا۔ دیباچہ ظہوری سہ نثر میں شامل ہوکر کلاسیکی مرتبہ تک پہنچ گیا جب کہ کتاب نورس کا نام تاریخ کے صفحات تک محدود رہ گیا''۔(ایضاً،ص ۲۳)

ترجمہ: چونکہ کتاب نورس دکنی زبان میں تھی، غیر ہندوستانی فارسی داں طبقہ نہ اس سے لطف اندوز ہوسکتا تھا اور نہ داد دے سکتا تھا، لہٰذا عادل شاہ نے درباری علما کو شرح نویسی کی خدمت پر مامور کیا، جنہوں نے کتاب نورس کے فارسی ترجمے کیے، لیکن مرتب متن کے مطابق عموماً لوگ ان ترجموں کے بارے میں خاموش ہیں البتہ عبدالرزاق یمنی نے اشارہ کیا ہے کہ اس کے بعض جملے فارسی قالب میں ڈھالے گئے۔ مرتب متن نے اس سلسلہ میں ملک اور ظہوری کا بھی بیان نقل کیا ہے اور اس سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے:

(الف) غیر ہندوستانیوں کو مستفید کرنے کے خیال سے ترجمہ ہوا۔

(ب) نورس کے ابیات کی شرح ہوئی۔ (ج) شرح متن سے مختصر تھی۔

لکھتے ہیں:

''ترجمہ میں بڑی عرق ریزی ہوئی مگر کسی کا ترجمہ حسب منشا نہ ہوا۔ چنانچہ یہاں تک حک واصلاح ہوئی کہ وہ بادشاہ کی تصنیف قرار پایا''۔

ایک ترجمہ بانکی پور کے نسخۂ کتاب نورس کے ساتھ فارسی میں شامل ہے، پروفیسر صاحب کے مطابق یہ ترجمہ نثر میں ہے اور تقریباً تحت اللفظ ہے اور اس میں کافی اختصار برتا گیا ہے۔ مرتب کا قیاس ہے کہ یہ وہی ترجمہ ہے جو بادشاہ کے حکم سے عمل میں آیا تھا، لیکن یہ بہت معیاری نہیں ہے حالانکہ ظہوری اور ملک وغیرہ علمائے وقت کی سرپرستی میں اس طرح کی غیر معیاری چیز قرین قیاس نہیں۔ لکھتے ہیں:

''چونکہ بہت سے لوگوں نے ترجمہ کیا تھا ممکن ہے ان میں سے کسی کا ترجمہ ہو جو بہت معیاری نہ ہوا ہو''۔(ص ۲۷)

کتاب نورس کی زبان: مرتب نے کتاب نورس کی لسانی خصوصیات پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، مقدمہ کا یہ حصہ ۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ تحریر کرتے ہیں:

> ''اس کتاب کی اہمیت اس کی لسانی خصوصیات کی بنا پر بہت زیادہ ہے، ابراہیم عادل شاہ کی تصنیف ہونے کی وجہ سے عام طور پر یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس کی زبان خالص دکنی ہے لیکن یہ قیاس پوری طرح صحیح نہیں ہے''۔ (ص ۲۷)

اس کے بعد کتاب نورس کی مندرجہ ذیل پانچ خصوصیات کا بیان ہے:

(الف) یہ کوئی باقاعدہ مسلسل نظم نہیں ہے بلکہ الگ الگ اشعار ہیں جو کیا بہ لحاظ انداز بیان اور کیا بہ اعتبار زبان وغیرہ ایک دوسرے سے اس قدر متفاوت ہیں کہ ان میں کوئی مشترک عنصر نظر نہیں آتا۔

(ب) دکنی نظمیں عام طور سے فارسی عروض کے سانچے میں ڈھالی گئی ہیں چنانچہ دکنی شاعروں نے فارسی اوزان کی پابندی کی ہے مگر کتاب نورس میں اس کی پابندی نہیں ہے۔

(ج) فارسی کے اصناف سخن قدیم اردو اور دکھنی میں بھی رائج ہوئے مگر ان میں سے کسی ایک کا تعلق کتاب نورس سے قائم نہ ہو سکا۔

(د) اس کتاب کے زیادہ ابیات دکھنی میں ہیں لیکن کچھ اشعار ایسے ہیں جن میں برج بھاشا، اودھی اور راجستھانی، پنجابی اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ بہر حال عمومی طور پر دکھنی رنگ غالب ہے۔

(ہ) اشعار میں عربی و فارسی الفاظ بہ کثرت استعمال ہوئے ہیں لیکن سنسکرت الفاظ یا تو اصل شکل میں یا ترمیم شدہ حالت میں اس طرح پائے جاتے ہیں کہ اگر دونوں قسم کے اشعار الگ الگ لکھ دیے جائیں تو کوئی شخص ہرگز یہ قیاس نہیں کر سکتا کہ یہ ایک ہی کتاب کے اجزاء اور ایک ہی مصنف کے اشعار ہیں۔

اس کے بعد مرتب نے نورس سے متعلق پندرہ لسانی خصوصیات کا ذکر کیا ہے، ذیل میں اختصار کے ساتھ انہیں پیش کیا جاتا ہے:

(۱) اسماء کو فعل کے طور پر استعمال کرنا یعنی اسماء سے مصادر بنالینا۔ مثلاً: چتر (تصویر) سے چترنا (تصویر کھینچنا) دیپ سے دیپنا (روشن کرنا) وغیرہ۔

(۲) کچھ اسماء ایسے مقرر کر لینا جو اور زبانوں میں نہ پائے جاتے ہوں۔ مثلاً سنسکرت میں

چتر کار (مصور) ہے مگر مصنف نے چتر سے چتاری اسم فاعل بنالیا ہے۔

(۳) دکنی جمع بنانے کا عام اصول یہ تھا کہ اس کے آخر میں ''اں'' کا اضافہ کرتے تھے خواہ وہ اسم مذکور ہو یا مونث، مثلاً بات سے باتاں، لوگ سے لوگاں، پلکھ سے پلکھاں، خوشی سے خوشیاں وغیرہ۔

(۴) اول تو افعال بہت کم استعمال ہوئے مگر جو آئے ہیں ان میں عام طور پر دکنی انداز ہے مثلاً ماضی کی حالت میں ''ی'' کا اضافہ جیسے ''لایا'' سے ''لیایا''، ''دیکھا'' سے ''دیکھیا''، ''رہا'' سے ''رہیا'' وغیرہ۔

(۵) فعل کی جمع اسی قاعدے سے بناتے ہیں جس طرح اسم کی جمع جیسے ڈھولتی سے ڈھولتیاں، جھومتی سے جھومتیاں، کیری سے کیریاں وغیرہ۔

(۶) عموماً فاعل اگر جمع مونث ہے تو فعل میں بھی وہی صیغہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ڈھولتیاں جھومتیاں، مدشراب بھگن، سب سہیلیاں وغیرہ۔

(۷) فارسی اور عربی کے الفاظ کی صورت سادہ کردی ہے۔ مثلاً عجب کو اجب، تراز و کو تراجو، کاغذ کو کاگت، خط کو کھت وغیرہ۔

(۸) اسی طرح سنسکرت کے الفاظ میں بھی ترمیم ہوئی ہے۔ مثلاً پری تم کے بجائے پیتیرم، شویت کے بجائے سیت، پاردھی کے بہ جائے پاردی وغیرہ۔

(۹) دکھنی الفاظ جو اس وقت رائج تھے، ان کا استعمال عام طور پر ہوا ہے۔ مثلاً ناد (آواز)، ہتھی (ہاتھی)، جانوا (زنّار)، کیری (کس کی)، درکھ (درخت)، مت (مست)، نسن دن (رات دن)، دیشت (دیکھنا)، نار (عورت)، دیسنا (دیکھنا)، ناری (عورت)، منج (مجھ کو)، سندری (عورت)، تج (تجھ کو)، مون (منہ)۔

(۱۰) بعض اسماء میں 'ی' بڑھاتے ہیں اور بعض میں 'ن' واؤ یا الف، جیسے کرن سے کیرن، دل سے دیل، دن سے دین، برسات سے برسانت، سیپی سے سینپی، سکھ سے سوکھ، دکھ سے دوکھ، چن سے چون وغیرہ اور بعض لفظوں میں حرفوں کو مقدم یا موخر کردیتے ہیں جیسے گناہ کے بجائے گنہا، سراہیں کے بجائے سرہائیں، پریت کے بجائے پیرت وغیرہ۔

(۱۱) بعض حروف (علّت، تشبیہ وغیرہ) خاص دکھنی رنگ میں استعمال ہوئے ہیں۔ جیسے

کدھو، تھیں، سوں کون، کر، بون، ہور وغیرہ۔

(۱۲) ضمائر کی پابندی میں کوئی خاص اصول نہیں برتا گیا۔ ضمیر فاعلی کا استعمال بہت ہی کم ہے۔

(۱۳) اسم اشارہ قریب کے لیے 'یہ' اور بعید کے لیے 'وہ' استعمال ہوا ہے۔

(۱۴) سب رس کے زمانے میں جب دو الفاظ کی تکرار ہوتی تھی تو ان کے درمیان ''یے'' کا اضافہ کرتے تھے مثلاً 'گھر گھر' کو 'گھرے گھر'، 'دردر' کو 'درے در' اور 'ٹھارٹھار' کو 'ٹھارے ٹھار' لکھتے تھے۔ مگر کتاب نورس میں تکرار الفاظ بغیر 'یے' کے اضافے کے موجود ہے جیسے جم جم، جگ جگ، گھر گھر، محل محل وغیرہ۔

(۱۵) تذکیر و تانیث کا خیال بعض جگہ نہیں کیا گیا ہے۔ مثلاً صفت اور جیبھ مذکر استعمال ہوا ہے۔

(۱۶) 'ہے' کے علاوہ آ جھے کا بار بار استعمال مختلف زبانوں کی یکسانیت کا پتہ دے رہا ہے۔

کتاب نورس میں برج بھاشا کا بھی جابجا استعمال ہوا ہے۔ اس سے متعلق چند مثالیں ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) کوئی کے بجائے ''کوؤ'' مثلاً:

حوراں پریاں چھپیاں کوڑا گاس کوؤ پتال

(۲) 'میری پتلی' کے بجائے 'پوتری میرو' مثلاً:

زلف تیری ، گلی آنکس پوتری میروہین ہتی

(۳) اکھیں بہ معنی 'کہیں' یا اکھوں 'کہوں':

پیارے چاند اکھوں کنت دن دوئی دکھی
من چاہئے سونس بھئی ہم تم رہیں اب سکھی

اخیر میں زبان سے متعلق پروفیسر صاحب تحریر کرتے ہیں:

''کتاب نورس کی زبان اس وقت کی مروجہ دکھنی سے ایک اور لحاظ سے نہ صرف مختلف تھی بلکہ بہت زیادہ مشکل ہوگئی تھی۔ اس میں سنسکرت کے الفاظ بہت کثرت سے استعمال ہوئے۔ علاوہ بریں اس میں ہندو دیومالا کے بہت سے حوالے

ملتے ہیں۔جن سے عام طور پر لوگ روشناس نہیں۔مگر بایں ہمہ کتاب کا معتد بہ حصہ آسان گیتوں پر مشتمل ہے خصوصاً جو گیت سید حسینی گیسو دراز کی مدح میں ہیں یا جن میں عاشقانہ جذبات کا اظہار ہے ان کی زبان سلیس اور سادہ ہے''۔(ص ۳۴)

کتاب نورس کی ادبی اہمیت: پروفیسر صاحب کے مطابق کتاب نورس کا مرتبہ ادبی نقطۂ نظر سے اس قدر بلند ہے کہ اس کو ادبی شہ پاروں کے زمرہ میں جگہ ملنا چاہیے۔مرتب نے کتاب نورس سے متعدد ابیات مع تشریح بہ طور نمونہ درج کی ہیں جس سے ابراہیم عادل شاہ کی بلند فطرت پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے،اور ان کی ادبی اہمیت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ذیل میں چند مثالیں بہ طور نمونہ پیش کی جاتی ہیں:

اس فراقوں ہوا ٹکڑے ٹکڑے دلا سمرن کیتی سب لی چون چون ملا
ترا دھیان امرت اب مرنا مشکلا

''میرا دوست مجھ سے رنجیدہ ہو کر چلا گیا،اس فراق میں میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا لیکن میں نے دل کے ٹکڑوں کو چن کر تسبیح بنالی اور اس کے نام کا ورد کرنا شروع کر دیا اس کا دھیان چونکہ آب حیات کی طرح حیات بخش واقع ہوا ہے لہٰذا اب مرنا ناممکن ہو گیا ہے''۔(ص ۳۶)

سوم دور سیت مُد سیام ما نونین سندری روپ لچھن
بادرا نچرتا پَرمُرت لاگے کب گپت کب پر گٹ دسے بدن

''چاند کی سفیدی وسیاہی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک خوبصورت عورت ہے۔بادل چاند کے چہرے پر ایسا ہے جیسا کسی حسین کے چہرہ کا آنچل جو ہوا کی وجہ سے کبھی چھپ جاتا ہے اور کبھی کھل جاتا ہے،کیسی بدیع ولطیف تشبیہ ہے''۔(ص ۳۹)

مقدمے کے آخر میں مرتب نے زیر نظر قلمی نسخوں کی کیفیت بیان کی،جدید ترتیب وتدوین کا یہ اصول ہے کہ جب کوئی مرتب ومدون کسی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخے کی ترتیب وتدوین کا کام انجام دیتا ہے تو دوران ترتیب جتنے نسخے پیش نظر ہوتے ہیں اس کی مکمل تفصیلات مقدمے میں یا آخر میں

ضمیمے کے طور پر بیان کر دیتا ہے۔ اس کی بہترین مثالیں مولانا عرشی اور رشید حسن خاں کی کتابوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

پروفیسر صاحب نے بھی جدید اصول تدوین کے مطابق نسخوں کی کیفیت بیان کی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے امورِ ذیل کی وضاحت کی ہے۔

۱۔ نسخے کا سائز، ۲۔ اس کی ضخامت، ۳۔ ہر صفحے میں سطروں کی تعداد، ۴۔ نسخے کا خط، ۵۔ متن کی روشنائی، ۶۔ اول و آخر کے اوراق کی مکمل کیفیت، ۷۔ عنوان کی کیفیت، ۹۔ نسخے کی اوراق کی کیفیت (بے ترتیبی اور کرم خوردگی کے لحاظ سے)، ۱۰۔ کاتب کا نام، ۱۱۔ اس کا تعارف لیاقت علمی، ۱۲۔ متعلقہ نسخے کی خصوصیات، ۱۳۔ سرورق کی کیفیت، ۱۴۔ سنہ تالیف، ۱۵۔ شواہد و قرائن، ۱۶۔ متن میں املائی غلطیاں، ۱۷۔ کاتب کے تسامحات اور غلطیاں، ۱۸۔ مہر کی کیفیات، ۱۹۔ استنباط نتائج وغیرہ۔

مقدمہ کے بعد اصل متن کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، یہ حصہ (ص ۶۳ سے ص ۱۱۲ تک) ۴۹ صفحات پر محیط ہے۔ اس مجموعہ میں ۱۷/راگوں کے ذیل میں کل ۵۹ گیت اور ۱۷ دوہے ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ بھوپالی (۲)، ۲۔ رام کری (۲)، ۳۔ بھیرو (۶)، ۴۔ جھیز (۱)، ۵۔ مارو (۲)، ۶۔ اساوری (۲)، ۷۔ دیسی (۱)، ۸۔ پوریا (۱)، ۹۔ براری (۱)، ۱۰۔ ٹوڈی (۴)، ۱۱۔ لار (۵)، ۱۲۔ گوری (۲)، ۱۳۔ کلیان (۴)، ۱۴۔ دھناسری (۲)، ۱۵۔ کنڑا یا کرناٹی (۱۹)، ۱۶۔ کیدارا (۴)، ۱۷۔ نوروز (۱)، کل تعداد ۵۹ ہے۔

انہوں نے جن ۹ نسخوں کے موازنے سے کتاب نورس کے متن کو تیار کیا ہے۔ یہ سارے نسخے ناقص اور بے ترتیب تھے جس کی وجہ اس کتاب کی ترتیب و تدوین نہایت دشوار تھی۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:

> ''سال سوا سال کی کوشش سے نو نسخے مجھے دستیاب ہو گئے، مگر یہ سب ناقص اور بے ترتیب تھے موضوع اور زبان کی دشواری۔ الفاظ کا صحت کے ساتھ پڑھا نہ جانا۔ صفحوں پر ہندسوں یا دوسرے نشان کی عدم موجودگی اور ہر نسخے کی الگ

ترتیب کی بنا پر تمام نسخوں کی ترتیب کا کام جس قدر دشوار تھا اس کا اندازہ صرف وہی لگا سکتے ہیں جن کو اس طرح کے کام سے سابقہ پڑا ہو"۔ (ص ۶)

جن نسخوں کی مدد سے متن کی تدوین کی گئی ہے، وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ نسخہ کتاب نورس (الف) مملوکہ دفتر دیوانی و مال سنٹرل ریکارڈ آفس، حیدرآباد۔

۲۔ ایضاً (ب) سالار جنگ میوزیم حیدرآباد (دکن)۔

۳۔ ایضاً (ج) مملوکہ پروفیسر حسین علی خاں حیدرآباد، دکن۔

۴۔ ایضاً (د) پرنس آف ویلز میوزیم ممبئی۔

۵۔ ایضاً (ی) مملوکہ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد، دکن۔

۶۔ ایضاً (ف) حیدرآباد میوزیم حیدرآباد، دکن۔

۷۔ ایضاً (گ) کتاب خانہ خدا بخش خاں بانکی پور، پٹنہ۔

۸۔ ایضاً (ج) کتاب خانہ رام پور (رضا لائبریری)۔

۹۔ ایضاً (ل) سالار جنگ میوزیم حیدرآباد، دکن۔

مندرجہ بالا نسخوں کی علامات بالترتیب ا، ب، ج، د، ی، ف، گ، چ، ل، قرار دی گئی ہیں۔ مرتب نے "کتاب نورس" کے اس متن میں گیتوں کی ترتیب اول الذکر تین نسخوں کے مطابق رکھی ہے۔ اس لیے کہ یہ تینوں نسخے بادشاہ کے عہد کے ہیں۔ ان تینوں میں نسخۂ اول کو ترجیح دی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"کتاب نورس کے اس متن میں تمام گیت پہلے تین نسخوں کے اعتبار سے ترتیب دیے گئے ہیں۔ یعنی ایک راگ کے تمام گیت ایک ساتھ درج ہوئے ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ تینوں نسخے بادشاہ کے عہد میں مرتب ہوئے تھے مگر ان میں بھی خصوصیت سے نسخۂ اول کی ترتیب پیش نظر ہے کیونکہ بہر حال اولاً اس کو دونوں نسخوں پر ایک گونہ وجہ ترجیح حاصل ہے، ثانیاً وہ تیسرے سے ملتا جلتا ہے، ثالثاً وہ سب سے زیادہ اشعار کو حاوی ہے"۔ (مقدمہ ص ۶۱ - ۶۲)

مندرجۂ ذیل امور کا بھی اہتمام کیا گیا ہے:

۱۔ نسخوں کے بعض قدیم طرزِ املا کو ترک کر دیا گیا ہے۔ مثلاً ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ، ڑ، ڑھ، ڑاں، گ، گھ کے بجائے ت، تھ، د، ڈھ، ر، رھ، ن، ک، کھ، کے نیچے تین نقطے لگائے گئے تھے مرتب نے اس طرح کے طرز املا میں مخطوطات کی پیروی نہیں کی ہے اور اسے رائج الوقت املا کے تحت لکھا ہے۔

۲۔ مخطوطات میں بعض الفاظ دو طرح پر ملتے ہیں: مثلاً آپیں، اپیں، آچرج، اچرج، اُتّم، اُتم، اوپماں، اُپماں پُور، پُر، پرنم، پنُم، جوتی، جوت، دینکر، دنکر، دھنی دھن وغیرہ۔ اس متن میں مرتب نے یہ دونوں شکلیں باقی رکھی ہیں۔

۳۔ چونکہ کتاب نورس قدیم دکنی الفاظ پر مبنی ہے، برج بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ بھی جابجا پائے جاتے ہیں، قدیم و نامانوس الفاظ کی کثرت ہے جس کی وجہ سے متن کا پڑھنا مشکل ہے لہٰذا مرتب نے قرأت میں آسانی کے لیے اعراب کا اہتمام کیا ہے جس کی وجہ سے متن کی قرأت میں آسانی ہوگئی ہے۔

۴۔ جیسا کہ ماقبل ذکر ہو چکا ہے کہ مرتب نے کتاب نورس کو ۹ نسخوں کی مدد سے مرتب کیا ان تمام نسخوں کے متن میں کثرت سے اختلافات تھے۔ مرتب نے اُن تین نسخوں کو بنیاد بنایا جو ابراہیم عادل شاہ کے عہد کے تھے۔ دیگر نسخوں کے اختلافات کو حاشیے (فٹ نوٹ) میں درج کر دیا ہے۔ راقم کے شمار کے مطابق اختلاف نسخ کی تعداد ۳۹۱ ہے۔ ذیل میں چند مثالیں بہ طور نمونہ پیش کی جاتی ہیں: دوہرا (۱)

نَورَس سُور جُگ جُگ جُوتی آنُڑ سَروُ گُنی   یُوسَتِ سرسُتی ماتا ابراہیم پرساد بھَیُ دُونی

درمقا (۲) بھوپالی نَورَس (۳)

حضرت مُحمد جگت ترگُر گُسائیں   تو درگہ چُمک مِیر وَمَنُ سَارُ

انترا (۵)

ترِلُوک جَپت تُو نانو پاوِیں پَران کی پُران۔ اَچرِج (۶) مہاپِیر (۷) اَبلاَ بَلی تو نہیں سانچُو اوتَار۔ مذکورہ بالا مثالوں میں جن الفاظ کے اختلافات حاشیے میں درج کیے گئے ہیں، وہ الفاظ درج ذیل ہیں: (۱) دوہرا (۲) درمقام (۳) نورس (۴) تو دَرگہ چُمک مہر و من سَار (۵) انترا (۶) اَچرِج (۷) پیر۔ ذیل میں اختلاف نسخ ملاحظہ فرمائیں:

(۱) یہ لفظ مختلف نسخوں میں مختلف آیا ہے، 'ا' میں دوہرہ 'ب' میں دوہڑہ، دوہرہ 'د'، 'ؤ'، 'ی' میں

دوہڑا، دوہرااور دوہا ’ف‘ میں دوہرا، دہرا، دہڑا ’’گ‘‘ میں دہرا۔ متن میں ہر جگہ ’’دوہرا‘‘ درج ہوا ہے۔
(۲) یہ لفظ ’م‘ اول مفتوح سے بھی آیا ہے، مگر متن میں م مضموم ہی درج ہوا ہے۔ (۳-ا): غائب۔
(۴) یہ مصرع مرقع عادل (ورق ۱۸ اب) میں عبدالرشید کے خط نسخ میں درج ہے۔ (۵-ا): غائب۔
(۶-ب): اچرَ چ د: اچرج ی: اچرج۔ (۷) پیر۔ (حاشیہ ص ۶۳)

ترجمہ کتاب نورس: متن کے بعد ترجمہ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ حصہ (ص ۱۱۳ سے ۱۴۱ تک) ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ چونکہ کتاب نورس کی زبان قدیم ونامانوس اور مشکل ترین زبان ہے۔ لہٰذا مرتب متن نے گیتوں کا ترجمہ بھی پیش کردیا ہے۔ یہ ترجمہ آسان اور عام فہم زبان میں ہے۔ ترجمے کے حصے میں ہر صفحے پر حواشی لگائے گئے ہیں۔ یہ حواشی بعض الفاظ کی تشریح، تلمیحات کی وضاحت، تاریخی واقعات، بعض عمارتوں اور اشخاص وغیرہ کے متعلق ہیں، راقم نے مطالعہ کے دوران ان حواشی کو شمار کیا تو اس کی کل تعداد ۹۳ معلوم ہوئی۔ حواشی کے اس اہتمام سے ترجمہ میں تحقیقی شان پیدا ہوگئی ہے اور ترجمہ طوالت سے بھی محفوظ رہا ہے۔ بطور نمونہ کتاب نورس کے چند ابیات کا متن مع ترجمہ اور اس کے متعلق حواشی ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

ا۔ گیت نمبر ۸: درمُقام بَھیرَ و(۱) ونَورَس (۲):

مُکھ (۳) گورا (۴) پھٹِک تِلکُ چھائی اَدَھر

تِلک اَکُشتَا سُو اِیسُوراَ گِنِ نیتَر

بَین

تِلَک چَندَن بیچ اَکُشتَا مَنڈَل سَمُدر مدھ (۵) میرُو پَربَتَا

یو اُو پَماں (۶) مُومَن لاگے نِس پتِی (۷) لچھَّن دَھرتا

ابھوگ

اُوپَما (۸) آ گھوں بھال (۹) تِلک جگتَّر

کَون گُنک کَسِے کَسُوٹی کَر اِبراہیم ہیم پَرچِت تارِکا (۱۰) مَدھوتَّہ پر

محبوب کا گورا چہرہ بلّور ہے، ہونٹ کا عکس تلک اور چاول کی تلک شیو کی

تیسری (۱) آنکھ کی آگ۔ سرخ چندن کے درمیان چاول کا سفید نشان ایسا معلوم ہوتا

ہے گویا سمندر میں میرو (۲) پربت ہے جس کے گرد سورج گھوم رہا ہے۔ میرے دل میں تلک کی تشبیہ کچھ اس طرح آرہی ہے کہ تلک چاند کے منہ پر کالا داغ یا دھبّہ ہے۔'' پیشانی کی تلک کسوٹی ہے جس پر سونا پرکھا جاتا ہے، ابراہیم کے پتلی کے موم سے سونے کی آزمائش (۳) کی ہے۔ (ترجمہ ۱۱۸)

مذکورہ ترجمہ کے بعض الفاظ کی تشریح یا وضاحت حاشیے میں اس طرح کی گئی ہے۔ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

۱۔انہوں نے اپنی تیسری آنکھ کی آگ سے کام دیو (خواہش نفسانی) کو جلا دیا تھا۔ ۲۔میرو پربت جو سمندر کے درمیان واقع ہے ہندو دیو مالا میں کافی اہم ہے۔ ۳۔کہا جاتا ہے کہ آزمائش کے وقت سونا موم کے ذریعے سے کسوٹی پر سے اٹھاتے ہیں۔ عاشق محبوب پر نظر کرتا ہے اور اس کے تلک کا عکس پتلی کے موم کے ذریعہ آنکھوں میں جمع کر لیتا ہے یہی سونے کی آزمائش ہے''۔ (ترجمہ ص ۱۱۸)

مذکورہ بالا مثالوں سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ کتاب نورس کا متن کتنا غیر مانوس ہے اور نذیر صاحب کا ترجمہ کتنا سادہ اور سلیس ہے۔

تلمیحات: کتاب نورس میں ہندو دیوی دیوتاؤں کے بہت سے قصے ملتے ہیں۔ اگرچہ ترجمے کے ضمن میں بعض کی صراحت ہوچکی ہے لیکن مرتب نے قارئین کی آسانی کے لیے متن میں استعمال شدہ تلمیحات کو یکجا کر کے مختصراً ان کی تشریح کردی ہے۔ چند اسلامی تلمیحات اور عہد ابراہیمی کی چند چیزوں کی بھی تصریح کی گئی ہے۔ یہ تلمیحات حروف تہجی کے اعتبار سے درج کی گئی ہیں۔ ان کی کل تعداد ۴۶ ہے۔ چند مثالیں ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

۱۔اچھرا: ''راجا اندر کے دربار کی پریاں اپسرا کہلاتی ہیں۔ ان کے علاوہ بعض اور اپسرائیں ہیں۔ جن میں سے کچھ کیلاس پر رہتی ہیں اور کچھ مہرو پر اچھرا اپسرا کی دوسری شکل ہے''۔ (ص ۱۴۲) ۲۔آخرت: ''قیامت کی پریشانی ضرب المثل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس روز آفتاب سوا نیزہ پر آجائے گا اور سارے لوگ شدت گرمی سے عاجز ہوجائیں گے''۔ (ص ۱۴۳) ۳۔لکشمی: ''دولت کی دیوی

اور وشنو یعنی پروردگار عالم کی بیوی‘‘۔(ص ۱۴۹) ۴۔گگن محل: ’’علی عادل شاہ اول کا بنوایا ہوا محل جو بیجاپور میں ہنوز پایا جاتا ہے‘‘۔(ص ۱۴۸)

فرہنگ: چونکہ کتاب نورس کی زبان گیارہویں صدی ہجری کی ہے، قدامت کی وجہ سے اکثر اس کے الفاظ غیر مانوس ہیں، عہد کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ زبانیں بھی ارتقاء کے مدارج طے کرتی رہتی ہیں، بہت سے الفاظ متروک ہوجاتے ہیں، یا زمانے کے انقلاب کے ساتھ الفاظ بھی نکھر سنور کر دوسری شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ زبان والفاظ کی تبدیلی کی وجہ سے نئے عہد کے قارئین قدما کی تصنیفات وتالیفات سے خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں کر پاتے ہیں۔

مرتب نے کتاب کے آخر میں فرہنگ کا بھی اہتمام کیا ہے۔ یہ (ص ۱۵۱ سے ۱۶۸ تک) ۱۸ صفحات پر مشتمل ہے۔اس فرہنگ کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے: ۱۔فرہنگ اول ۲۔فرہنگ دوم۔

۱۔فرہنگ اول: پروفیسر صاحب کے مطابق یہ فرہنگ نسخہ ’’ی‘‘ کے شروع میں ’’لغات بہ زبان ہندی‘‘ کے عنوان سے درج ہے۔اس میں کچھ الفاظ حروف تہجی کے اعتبار سے ہیں اور باقی بے ترتیب۔ مرتب متن نے وہ سب الفاظ حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دے کر کتاب نورس کے آخر میں شامل کردیے ہیں۔ یہ فرہنگ ۳/۵۸۷ الفاظ پر مشتمل ہے۔بعض بعض مقامات پر لفظوں کے معنی میں مرتب نے اضافہ کیا ہے اور اسے امتیاز کے لیے قوسین میں درج کیا ہے۔

۲۔فرہنگ دوم: یہ اضافۂ مرتب ہے۔ یہ کل ۱۵۹ الفاظ پر مشتمل ہے۔ یہ بھی حروف تہجی کے اعتبار سے ہے۔

مجموعی طور پر یہ فرہنگ ۷۵۳ الفاظ پر مشتمل ہے۔ دونوں فرہنگ کے اہتمام سے کتاب نورس کے اکثر مشکل الفاظ اور متن کی توضیح وتفہیم میں آسانی ہوگئی ہے۔

مذکورہ بالا مثالوں سے کتاب نورس کی تدوین کے طریق کار کا بہ خوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ پروفیسر نذیر احمد ایک مستند محقق تھے۔ان کا طریق کار یہ تھا کہ کسی نتیجے کے استنباط کے لیے تمام داخلی وخارجی شواہد کو بروئے کار لایا جائے اور پھران کی روشنی میں نتائج کا استخراج کیا جائے۔

فوقؔ کے ''نغمہ وگلزار'' میں کشمیر کی عکاسی

جناب محمد یاسین گنائی

محمدالدین فوقؔ ایک ہمہ گیر و ہمہ پہلو شخصیت کا نام ہے۔ بیک وقت پختہ مشق صحافی، دیدہ ور مورخ، شعلہ بار شاعر، انشا پرداز، تذکرہ نگار، بے باک و بے لوث سیاست داں، کامیاب مقرر، ہر دل عزیز، سماجی رکن اور کشمیر کے حقیقی ترجمان کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں ان کا نام افق تا شفق پہنچا۔ ان کی ولادت ۱۸۷۷ء میں کشمیر میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۸۹۴ء میں محکمہ پرمٹ میں ملازم ہوئے مگر صحافتی مزاج کی وجہ سے یہ نوکری چھوڑ دی۔ وہ پہلے کشمیری مسلمان شخص ہیں جنہوں نے کشمیر کے مسلمانوں کے مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے لاہور سے ۱۹۰۱ء میں اخبار ''پنجہ فولاد'' جاری کیا۔ اس کے بعد ۱۹۰۶ء میں ایک ماہنامہ ''کشمیری میگزین'' جاری کیا جو ۱۹۱۲ء سے روزنامہ کی شکل میں ''اخبار کشمیر'' کے نام سے شائع ہونے لگا۔ (محی الدین، ص ۴۳-۴۲) یہ اخبار کشمیر کے تاریخی، سیاسی اور سماجی مسائل سے سروکار رکھتا تھا اور اس نے کشمیریوں میں آزادی کا جوش پیدا کرنے میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ ان کا تخلص پہلے شوق تھا لیکن ۱۸۹۷ء سے انہوں نے فوق تخلص اختیار کیا۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ ابتدا میں وہ داغ دہلوی سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ بعد میں چند اور عظیم اساتذہ سخن سے بھی اصلاح لی۔ علامہ اقبال سے بھی گہرے مراسم تھے۔ ان کا انتقال ۱۴ر ستمبر ۱۹۴۵ء میں سری نگر میں ہوا۔

انہوں نے متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا اور ناول، افسانہ، سوانح، تذکرہ، تاریخ، شاعری، صحافت وغیرہ میں ان کے متعدد کارنامے موجود ہیں۔ ان کا شمار کشمیر کے اولین ناول نگاروں میں بھی ہوتا ہے انہوں نے ناول ''انارکلی (۱۹۰۰ء)، اکبر (۱۹۰۹ء) ناصح مشفق، غریب الدیار، نیم حکیم جیسے

ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، دیوی اہلیہ وشو ودیالیہ اندور، ایم۔ پی (انڈیا)۔

بہترین ناول لکھے ہیں۔ ناول ''انارکلی'' کے دیباچہ میں انہوں نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ اس ناول کا پلاٹ فرضی نہیں حقیقی ہے اور اس کی تاریخی شہادت ہے۔ اس زمانے میں امتیاز علی تاج کا شاہکار ڈراما ''انارکلی'' وجود میں نہیں آیا تھا۔ (پریمی، ص: ۱۵۲) ان کا مجموعہ اشعار ''کلام فوق'' کے نام سے منظر عام پر آ چکے۔ وہ فطری شاعر تھے اور آمد ہوتی تو ایک انبار لگ جاتا۔ جوش کسی وجہ سے کم ہوتا تو لمبے عرصے تک لکھنا ہی ترک کر دیتے تھے۔ محمد عبداللہ نے فوق کے زیر مطالعہ مجموعہ کلام ''نغمہ و گلزار'' کے دیباجہ میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اکتوبر ۱۹۰۹ء میں فوق صاحب راجہ غلام محمد خان صاحب کی جاگیر میں مقیم تھے کہ ایک سہانی صبح، دل کو شاد کرنے والے موسم بہار کی سحر خیزی میں فوق کی زبان سے بے اختیار یہ شعر نکل گیا ؎

ہم بڑی مدت سے سنتے تھے کہ ہے دیندار فوقؔ
جب اسے پرکھا تو وہ دنیا کے بھی قابل نہ تھا

کئی سال گذر گئے، ۷/ستمبر ۱۹۳۲ء کو رات کے وقت فوق کی زبان سے یہی شعر نکلا اور پھر انہوں نے فوراً قلم کاغذ ہاتھ میں لے ایک بہترین غزل تیار کی اور غزل کا مطلع یوں موزوں کیا ؎

یہ مذاق درد یہ ذوق خلش حاصل نہ تھا
تجھ سے جب الفت نہ تھی پہلو میں شاید دل نہ تھا (فوقؔ، ص ۷)

ان کی طرفہ طبیعت کی ایک شہادت یہ بھی ملتی ہے کہ انہوں نے ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۲ء تک اور ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک شاعری بالکل ترک کر دی تھی (۲) (فوق، ص: ۹) جس کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی ہے البتہ اس وقت ان کی دلی خواہش صحافت، سیاست اور سیاحت کی طرف تھی۔ ایک دن سردیوں کے موسم میں ۲۱/جنوری ۱۹۳۹ء کو انارکلی بازار لاہور سے گزر رہے تھے کہ ان کی نظر ایک مضمحل کتّے پر پڑی جو زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا۔ یہ منظر دیکھ کر فوق کی زبان پر یہ شعر آ گیا ؎

نہیں یہ جان کنی کا وقت اے موت
یہ تیرا خیر مقدم ہو رہا ہے (فوق، ص ۱۰)

ایک واقعہ محمد عبداللہ صاحب نے ۱۹۳۲ء کا اس مجموعہ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ فوق اس دن ڈاکٹر عبدالواحد صاحب کے گھر پر تھے۔ پہلے ہی سے بیمار تھے لیکن رات کے سناٹے اور

سردی کی شدت کی وجہ سے جب سر درد میں لگاتار بڑھنے لگا تو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو آواز دینے کے بجائے دل کی آواز پر دھیان دیا۔ جہاں بے قراری اور آہ وزاری کے بیچ یہ شعر اظہار حقیقت کررہا تھا ؎

جس سے مایوس مسیحا ہے وہ بیمار ہوں میں
موت ہی جس کا مداوا ہے وہ آزار ہوں میں (فوق، ص ۱۱)

فوق کا پہلا مجموعہ کلام ۱۹۰۹ء میں دو حصوں پر مشتمل شائع ہوا تھا۔ جس کا پہلا حصہ ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۱ء تک کے کلام پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۹ء تک کے کلام کا ہے۔ یہ مجموعہ کلام ۱۹۳۲ء میں پروفیسر محمد علیم الدین کے دیباچہ کے ساتھ دوسری بار شائع ہوا۔ اسی کے بعد ۱۹۴۱ء میں ان کا دوسرا مجموعہ کلام ''نغمہ وگلزار'' کے نام سے شائع ہوا، جس میں محمد عبداللہ صاحب کا ایک عمدہ دیباچہ بھی شامل ہے۔ اس مجموعہ میں اپریل ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۰ء تک کا کلام شامل ہے یہ زیادہ تر نظموں پر مشتمل ہے۔ اس میں قومی، سیاسی، ملکی، اصلاحی، مقصدی، کشمیر کی عکاسی کی شاعری ہے۔ جب یہ مجموعہ کلام تیار ہوا تو سیماب اکبرآبادی اور مولانا تاج الدین تاج لاہوری نے جو نظمیں بھیجی تھیں ان کو بھی ابتدائیہ کے طور پر شامل کیا گیا۔ سیماب نے اپنی نظم میں فوق اور مجموعہ کلام کے محاسن پیش کیے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نغمہ و گلزار ان کا چھپ گیا دفتر افکار ان کا چھپ گیا
ان کے نغمے جب سنیں گے اہل دل کیف حاصل ہوگا ان کو متصل
وہ مفکر بھی ہیں اور شاعر بھی ہیں اور فنِ شعر کے ماہر بھی ہیں
حضرت اقبالؔ کے ہیں ہم نشین صاحب وجدان و عرفان و یقین
(فوقؔ، ص: ۳۰)

''نغمہ وگلزار'' اب انمول کتابوں کی فہرست میں شامل ہے اور اگر کشمیر کی بات کریں تو ایک امر سنگھ کالج کی لائبریری کو چھوڑ کر اس کا کوئی نام ونشان نہیں ملتا ہے۔ سیلاب ۲۰۱۴ء کی وجہ سے جہاں کشمیر میں جانی اور مالی بہت نقصان ہوا تھا جس کی تلافی کرنا بہت مشکل ہے۔ ابھی تک کشمیر میں اس قسم کی کوئی تحقیق شروع نہیں ہوئی جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ ادب کا کتنا نقصان ہوا۔

سری نگر شہر کی بڑی لائبریریاں سب سیلاب کی زد میں آگئیں اور کتابوں کا اس حد تک نقصان ہوا کہ کلچرل اکادمی، امر سنگھ کالج، سری پرتاپ کالج، گاندھی کالج، بیمنہ کالج، سری پرتاپ لائبریری وغیرہ میں پرانی کتابوں کا جیسے وجود ہی نہیں رہا اور اگر کچھ بچ گیا تو اس کو ردی کا مال سمجھ کر کباڑ کے حوالے کیا گیا۔

اس مجموعہ کلام میں شامل نظموں اور غزلوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلی قسم میں کشمیر کی عکاسی نہایت وسیع پیمانے پر ملتی ہے۔ دوسری قسم میں ترقی پسند خیالات ملتے ہیں کیونکہ اس دور میں ہندوستان کے ساتھ ساتھ کشمیر میں بھی ترقی پسند تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس قسم کی نظموں میں ''کشمیر کا ناس مشکہ (رشوت)، فقیری میں امیری، عرق شرم گناہ، امیر اور غریب، نادانی، جوانی کا پیغام، دست ناتواں، تھوک کا امتحان، زمانہ جاگ اٹھا تو سو رہا ہے، محاسبہ نفس یا نامۂ اعمال کی پڑتال، مالِ مست سے ایک سوال، مزدور کے متعلق ارشاد نبویؐ، مزدور کی قیمت، آدمی کا آدمی شیطان ہے'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ تیسری قسم میں وہ کلام ہے جو کسی کی شادی، موت، پیدائش، وظیفہ یابی وغیرہ کی مناسبت سے ہے۔ ان نظموں میں ''سالگرہ مہاراجہ کرن سنگھ بہادر، فوق ویسا ہی ہے، سالگرہ مہاراجہ سری ہری سنگھ بہادر، حیات بعد الموت، خیر مقدم، مرحوم بھائی کا صدمہ، قطعہ تاریخ وفات اہلیہ دوم'' وغیرہ شامل ہیں اور چوتھی قسم میں وہ نظمیں ہیں جو کسی مشاعرے، کانفرنس، سمینار، اسکول و تعلیم وغیرہ کے بارے میں لکھی گئی تھی۔ مثلاً کشمیر یونیورسٹی، تعلیم بالغان، تحریک تعلیم بالغان، دہقان اور تعلیم، تعلیم بالغان کے خوشگوار نتائج وغیرہ۔

فوق کشمیری ہیں، اس لیے ان کی شاعری میں ہر جگہ کشمیر کی عکاسی و ترجمانی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ علیم الدین سالک رقم طراز ہیں کہ ''فوق صاحب پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مستقل طور پر مسلمانانِ کشمیر کی ترجمانی کرتے ہوئے اہل عالم کو ان کی مظلومی سے روشناس کرایا''۔ (مشعل، ص: ۲۰۷) مہاراجہ ہری سنگھ کی سالگرہ کے موقع پر جہاں متعدد شعراء نے اپنی عقیدت کا اظہار کیا تھا وہیں فوق نے بھی ۷/ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو ایک نظم ''کشمیر یونیورسٹی'' پڑھی تھی۔ وہ کوئی ایسا موقع چھوڑنے والے نہیں تھے جس سے ملک کا فائدہ ہوا۔ ہری سنگھ کے یوم پیدائش پر ان کو لگا کہ وہ اس خوشی میں یونیورسٹی قائم کرنے کی اجازت دے سکتا ہے اس لیے یہ نظم پڑھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مرا کشمیر بھی ہندوستان بھر میں غنیمت ہے جہاں علم و ہنر کے دیر تک چشمے رہے جاری
اسی کشمیر میں بڈشاہ و شاہ معظم تھا کہ جس دور میں تھی علم وفن کی گرم بازاری
بہت نازاں ہیں میسور ودکن یونیورسٹی پر کہ جس کے دم قدم سے قومیت کی لہر ہو جاری
(فوق،ص:۴۱)

یعنی فوق کشمیر میں ایک یونیوسٹی کے قیام کا خواب دیکھتے تھے اور انھوں نے ہری سنگھ کو ماضی کے بادشاہوں کی عظمت یاد دلائی۔ وہ ایک بہتر سماج کے قائل تھے اسی لیے جب شیخ محمد عبداللہ اور مولوی محمد یوسف شاہ کا آپس میں ٹکراؤ بڑھتا گیا اور انھوں نے اپنے ترجمان اخبارات "صداقت" جو نیشنل کانفرنس کا ترجمان اخبار تھا اور "اسلام" جو مولوی محمد یوسف شاہ کی پارٹی کا ترجمان اخبار تھا" میں ایک دوسرے پر کھلے عام کیچڑ اچھالنا شروع کیا۔ تو فوق پر یہ الزام تراشی گراں گزری اور انھوں نے نظم "کشمیر مسلم پالیٹکس ۱۹۴۳ء میں" لکھ کر ایک طرف اس بے ہودہ عیب جوئی کی طرف اشارہ کیا اور دوسری طرف کشمیر کی اخوت، ہمدردی اور مہمان نوازی کی یاد دلائی۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار ؎

رنگ لائے گا کس دن وہ سماں کشمیر میں ہوں گے جب آج کے بچے جواں کشمیر میں
سورہ اخلاص کے سمجھے معانی کیا کوئی مٹ گیا اخلاص کا نام ونشاں کشمیر میں
(فوق،ص:۳۷)

جنت نظیر کشمیر میں سیاحوں کی آمد و رفت شاید ہمیشہ اس کی زندگی کا حصہ رہی۔ اسی طرح کے ایک سیاحتی پروگرام میں فوق پہلگام گئے ہوئے تھے جہاں ان کا ارادہ تھا کہ وہ ہندوؤں کی مقدس زیارت امرناتھ کی سیر کریں گے لیکن امرناتھ کا راستہ نالہ لدر (چھوٹا دریا) سے ہو کر جاتا ہے۔ جس کے پانی کا رنگ پیلا دکھائی دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کو لدر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس دریا کی لہروں، صفائی، ٹھنڈک اور کشش کا منظر ان الفاظ میں بیان کیا ؎

وہ سین دیکھے ساحل دریائے لدر پر چمکے ستارہ بن کے جو ظلمات شام میں
آئے تھے ہم بھی سیر امرناتھ کے لیے دل تھام کے رہ گئے پر پہلگام میں
(فوق،ص۳۹)

درحقیقت یہ مجموعہ کلام کشمیر کے ذرہ ذرہ کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ اس میں پہاڑوں،

جھیلوں، دریاوں، جنگلوں، وادیوں، انسانوں، دیہات، شہر، اسکول، امیر غریب، مہاراجہ، ندی نالے غرض سب نظر آتے ہیں۔ ''فوقیت کشمیر، ایک سرسبز شاداب وادی میں، کشمیر سے مطلب، ندہ مستقبل، میرا وطن، بڈشاہ پادشاہ، خطہ کشمیر پہلے اور تھا اب اور ہے، ہمیں نے دیدہ بینا نہ پایا، پروانہ کر، جو یار نے دیکھے وہ یار مار دیکھے اور کشمیر اور عرش'' وغیرہ۔ نظموں میں منظر نگاری کے آبشار نظر آتے ہیں۔ نظم ''سرسبز و شاداب وادی میں'' انہوں نے پونچھ کی چھوٹی چھوٹی وادیوں، چشموں، پہاڑوں اور جنگلوں کی دل کھول کر ترجمانی کی ہے۔ اس نظم میں کشمیر کی عکاسی کا ایک نہایت دلفریب انداز نظر آتا ہے۔ چند اشعار ؂

منظر دشت بس یہاں گو بہت سنسان تھے — دل کے دریائے تلاطم خیز میں طوفان تھے

کوہ تھے ٹیلے تھے یا نالے تھے یا میدان تھے — کثرت گلہائے خودرو سے بہارستان تھے

(فوق، ص ۵۲)

پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے مراسم علامہ اقبال، داغ دہلوی، سیماب اکبر آبادی، تاج لاہوری جیسے عظیم شعراء سے تھے۔ اکبر الہ آبادی نے ان کی شاعری کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

> ''کلام فوق بلاشبہہ قابل داد ہے۔ جب خیالات اچھے ہیں کلام کیوں نہ اچھا ہو۔ کلام فوق میں فطری آرزوئیں بھی ہیں، شوخی کا اظہار بھی، قافیے برجستہ ہیں۔ بغیر تکلیف کے کلام کا اکثر حصہ ہے اور اثر پیدا کرتا ایسا ہی کلام ہے۔ بعض اشعار سے دلچسپ رندانہ رنگ قطرہ ہائے مے کی طرح ٹپک رہا ہے، کئی اشعار گنجینہ معانی ہیں۔ بہت سے اشعار میرے حسب حال ہیں نیچرل کیفیتوں کے اظہار اور کشمیر کے نظاروں میں خوب جوش دکھایا ہے اور نظموں کے شان نزول نے آپ کی جدت آفرینی کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے''۔ (فوق، ص ۱۵)

فوق کے کلام میں حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ان کا جوش و جذبہ، حب وطن اور مناظر فطرت کی عکاسی چکبست، جوش، فیض اور اقبال کی یاد دلاتی ہے۔ ان کی نظم ''میرا وطن'' میں چکبست کا رنگ صاف طور پر نظر آتا ہے یہ نظم انہوں نے ۱۴/ جولائی ۱۹۲۸ء میں اپنے دوست حبیب اللہ صاحب کی فرمائش پر قلم بند کی تھی۔ اس نظم کے دو بند ؂

گل مرگ ولدررو دانگت کی وادیاں جہاں ہیں
فردوس کی فضا میں آبادیاں جہاں ہیں
صحت فزا ہوا کو آزادیاں جہاں ہیں
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے
میر علیؒ ہمدانی کا جس جگہ تھا پھیرا
مخدوم شیخ حمزہؒ کا جس جگہ تھا ڈیرا
رش پیر شاہ عالم کا تھا جہان بسیرا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے (فوق،ص ۲۶)

ایک اور نظم میں کشمیر کی حسین وادیاں رقص کرتی نظر آتی ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کی ایک نرالی نظم ہے۔ یہ ۹/ جولائی ۱۹۳۹ء کو ہالہ نام کی جگہ کو دیکھ کر چکبست کی ایک خوبصورت نظم کی تضمین کے طور پر لکھی گئی۔ جب وہ اس مقام پر پہنچے تو چکبست کا یہ شعر ان کی زبان پر آ گیا ؎

ذرّہ ذرّہ ہے میرے کشمیر کا مہماں نواز راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

اس نظم کے مطالعہ سے جہاں چکبست کی یاد تازہ ہوتی ہے وہیں کشمیر کی مہمان نوازی جس کے لیے کشمیر اپنی مثال آپ ہے اس کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اس کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں کشمیر کے پرانے اضلاع کمراز اور مراز کا ذکر ملتا ہے۔ اس میں اخلاص، سوز و گداز، غربت، فطرت وغیرہ کا ذکر ہے۔ ان کی شاعری میں عام ہندوستانی نوجوانوں کے جذبات وخیالات کا اظہار بھی ملتا ہے اور کشمیر کے ہلاکت زدہ، پس ماندہ اور حالات کے مارے ہوئے باشندوں کا ذکر بھی ہے۔ پیش ہے اس نظم کا ایک بند ؎

کونہ کونہ ہے مرے کشمیر کا جنت طراز گوشہ گوشہ ہے مرے کشمیر کا قدرت کا راز
بچہ بچہ ہے مرے کشمیر کا شایان ناز ذرہ ذرہ ہے مرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے (فوق،ص ۱۰۴)

''نغمہ وگلزار'' شعری مجموعہ بلکہ کشمیر کی حقیقت کا ترجمان ہے۔ اس میں شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک تمام سیاحتی مقامات کی منظر کشی ہے۔ جہاں جنوبی کشمیر کا پہلگام اپنی خوبصورتی

بکھیرتا نظر آتا ہے وہیں شمالی کشمیر کا بنگس بھی اپنی پُر کشش و پر فضا وادیوں میں آنے کی دعوت دیتا نظر آتا ہے۔ نظم کا عنوان وہ سیدھے سادے انداز سے دیتے ہیں۔ وہ فلسفیانہ پیچیدگیوں اور گنجلک بندشوں کے قائل نہیں تھے۔ اگر وہ محنت کش شاعروں کی طرح وقت نکالتے، تو شاید شاعری میں ان کا مقام بلند ہوتا۔ اس مجموعہ کی آخری نظموں میں ''وادیے ماور۔ و۔ رجوار'' پر نظر ڈالیں تو بظاہر یہ کوئی خاص نظم نہیں لگتی ہے لیکن جب اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ ان کی ایک شاہکار نظم کہلانے کی حق دار نظر آتی ہے۔ یہ شمالی کشمیر کے دو علاقوں ماور اور راجوار کے نام پر ہے۔ ماور دراصل یہاں سے گزرنے والا ایک نالہ (چھوٹا سا دریا) ہے جس کا پانی تحصیل ہندوارہ کے پورے علاقہ کو سیراب کرتا ہے۔ ''راجوار'' اس کے متصل ایک سرسبز و شاداب پہاڑ کے دامن میں بسنے والا علاقہ ہے۔ اس پورے علاقے کی اہمیت سیاحتی مقام ''بنگس'' کی وجہ سے بڑھ جاتی ہے جس کا ذکر اس نظم میں ملتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

یہ پہاڑوں کی قطار اندر قطار جس کی ہر وادی پہ خود قدرت نثار
کوہ کی چوٹی پہ سبزے کی بہار دیکھ کے جس کو دیکھیں بار بار
یہ درہ اور یہ ہوا کی سائیں سائیں
اور وادی کے مناظر دائیں بائیں
اک ندی آتی ہے لہراتی ہوئی زور پر پانی کے اتراتی ہوئی
راہ کی ہر شے کو ٹھکراتی ہوئی بلکہ آگے آگے لے جاتی ہوئی
ہے نڈر وہ حق پرستوں کی طرح
چال بھی پہلے اس کی مستوں کی طرح (فوق، ص ۱۲۲)

فوق نے کم وبیش سو کتابیں تصنیف کی ہیں۔ یہاں ہم تمام کتابوں کا نام نہیں گنا سکتے البتہ کشمیر کے بارے میں انہوں نے جو کتابیں لکھی ہیں ان میں ''کشمیر کا نادر شاہ (مہاراجہ رنجیت سنگھ)، تاریخ کا روشن پہلو، کلام فوق، شالامار باغ، مکمل تاریخ کشمیر، حکایات کشمیر، شاہی سیر کشمیر، لل عارف، غنی کشمیری، شباب کشمیر، سفر نامہ کشمیر، سیاست کشمیر، مشاہیرِ کشمیر، تاریخ اقوام کشمیر (تین جلد)، رہنمائے کشمیر، تذکرہ مصنّفین و مولفین کشمیر، تذکرہ مفتیان کشمیر، کشمیر کی رانیاں، تمدنِ کشمیر، جغرافیہ

پونچھ، راجہ سکھ جیون مل، خواتین کشمیر، تاریخ بڈشاہ وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔(سروری، ص ۲۰۸) بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ان کتابوں کی حیثیت اب حوالہ جاتی کتابوں کی سی ہے ان کتابوں سے اس بات کی خوشی ملتی ہے کہ اگر خدانا خواستہ کشمیر کی تمام تاریخ خاک ہوجائے تو فوق کی ان کتابوں سے قدیم وجدید کی ایک نئی تاریخ تیار ہوسکتی ہے۔ان کی نثر وشعر میں زبان کی سادگی اور سلاست، محاورات میں درستی، صحت بیان میں روانی اور ندرت، خیالات میں شستگی ومتانت اور ادائے مطالب میں بے ساختہ پن نظر آتا ہے۔یہی خوبیاں ان کے اس مجموعہ کلام نغمہ وگلزار میں نمایاں ہیں۔اقبال کی ''بانگ درا'' کی طرح فوق کا یہ مجموعہ کلام بھی ہے، جس کی عظمت ورفعت اردو ادب میں ہمیشہ تازہ دم اور پرکشش رہے گی۔

حوالہ جات

(۱) مشعل سلطان پوری، ترقی پسند کشمیری ادب، میزان پبلشرز سری نگر، ۲۰۱۵ء۔(۲) فوق، محمد الدین، نغمہ وگلزار، ظفر برادران تاجران کتب، سری نگر کشمیر (لاہور، پنجاب) ۱۹۴۱ء۔(۳) سروری، پروفیسر عبدالقادر، کشمیر میں اردو (حصہ ۲)، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر، ۱۹۸۲ء۔(۴) محی الدین، صوفی، جموں و کشمیر میں اردو صحافت، اشرف بک سنٹر ریڈ کراس روڈ، سری نگر کشمیر، ۲۰۰۶ء۔(۵) پریمی، ڈاکٹر برج، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشوونما (تنقید وتحقیق)، رچنا پبلی کیشنز، جانی پورہ جموں، چوتھا ایڈیشن ۲۰۱۳ء۔

اخبار علمیہ

''اسمارٹ چھتری''

سعودی عرب کے ایک طالب علم کامل بدوی نے فلسطینی طالبہ منال دندیس کے تعاون سے شمسی توانائی سے چلنے والی چھتری ایجاد کی ہے جو نہ صرف سایہ فراہم کرے گی بلکہ باقاعدہ ٹھنڈک، رات کی تاریکی میں روشنی اور حسب ضرورت دوسرے لوگوں سے رابطہ کی سہولت بھی فراہم کرے گی۔ کامل بدوی کا کہنا ہے کہ انہوں نے بچپن ہی میں سوچ لیا تھا کہ حجاج کرام کو گرمی سے نجات دلانے کے لیے کوئی منفرد چیز ایجاد کریں گے۔ بالآخر انہوں نے یہ اسمارٹ چھتری ایجاد کی۔ ان کا بیان ہے کہ عموماً لوگ یورپی ملکوں، گرم خطوں اور حج کے مواقع پر گرمی سے بچنے کے لیے چھتری کا سہارا لیتے ہیں مگر روایتی چھتری گرمی کی شدت کم اور ٹھنڈک کا احساس پیدا کرنے میں زیادہ کارگر نہیں ہوتی۔ یہ چھتری ان دونوں مقاصد کو پیش نظر رکھ کر تیار کی گئی ہے۔ چھتری کے اندر چھوٹا پنکھا نصب کرنے کا خیال ہے جو جی پی ایس سسٹم کے ذریعہ شمسی توانائی سے چارج ہونے کے ساتھ ٹھنڈک بھی فراہم کرے گا۔ مختلف ڈیوائس مثلاً لیپ ٹاپ، ٹیبلٹ اور موبائل فون وغیرہ بھی اس سے چارج ہوسکیں گے۔ اس میں ایک چھوٹی لائٹ بھی نصب ہوگی جو رات کی تاریکی میں اجالا بھی فراہم کرے گی۔ (مرکز اطلاعات فلسطین، ۹/اگست ۲۰۱۶ء)

''سٹیزن اینڈ سوسائٹی''

عالی جناب حامد انصاری ملک کے دوسرے سب سے باوقار عہدہ پر فائز ہیں۔ ملک کے عظیم دانشور، ذمہ دار سفیر اور انتہائی حساس شہری کے طور پر ان کی شناخت ہے۔ انہوں نے حال ہی میں اس نام سے ایک کتاب تحریر کی ہے۔ جو خود ان کے مختلف موضوعات پر دیے گئے خطبات کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا اجرا بجا طور پر صدر جمہوریہ ہند کے ہاتھوں عمل میں لایا گیا۔ صدر نے نائب صدر کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''انہیں عام طور پر کتابیں ملتی رہتی ہیں لیکن یہ ایک منفرد معاملہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ نائب صدر کے عہدہ کی پہلی مدت کے لیے جب انہوں نے حلف لیا تو کسی نے سوال کیا کہ وہ غیر سیاسی شخصیت ہیں تو ان کا جواب تھا کہ کوئی شہری غیر سیاسی نہیں ہوتا۔ اس سے ایک ذمہ دار شہری کے متعلق ان کی سوچ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد صدر نے کتاب کے موضوعات ومباحث پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور کہا کہ مسٹر انصاری نے جمہوریت کی حقیقت پر بہت وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور سب سے اچھی

بات یہ ہے کہ بھارتی جمہوریت کو مسلسل اپنے شہریوں کے ذریعہ پرورش کی ضرورت ہے“۔ایک ذمہ دار شہری اور جمہوری معاشرہ کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

”موریطانیہ میں ادائیگی مہر کا انوکھا طریقہ“

حال ہی میں موریطانیہ کے صدر مقام نواکشوط کی الترحیل کالونی میں ادائیگی مہر کا ایک عجیب طریقہ سامنے آیا ہے۔رپورٹ کے مطابق ایک باپ نے اپنی بیٹی کے عوض مہر رقم،سونا یا جائیداد کے بجائے نوشہ سے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک ملین یعنی دس لاکھ مرتبہ درود بھیجنے کا مطالبہ کیا ہے اور اس کا اصرار ہے کہ نکاح فارم میں ”ایک ملین درود“ درج کیا جائے۔نوشہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بے روزگار ہے۔سسر نے تقاضہ کیا ہے کہ ایسا کرنے سے وہ اپنی بیٹی کے حق مہر سے دست بردار ہو جائے گا۔سوشل میڈیا پر اس واقعہ کی حمایت و مخالفت میں دونوں طرح کے تبصرے موجود ہیں۔اس کے حامیوں کا کہنا ہے کہ اس اقدام سے شادی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے میں مدد ملے گی،جب کہ مخالفین اس کو اسلام میں ”بدعت“ قرار دے رہے ہیں۔واضح ہو کہ موریطانیہ میں یہ قبیح اصول رائج ہے جس کے مطابق عورت نان نفقہ سے دست بردار ہو کر طلاق کا حق اپنے پاس رکھ لیتی ہے اور لڑائی اور ناراضگی کی صورت میں بیوی میکہ چلی جائے تو طلاق واقع ہو جاتی ہے۔(یہ خبر العربیہ ڈاٹ نٹ پر موجود ہے)

”انڈونیشیا میں سالانہ ایک لاکھ موت“

گذشتہ برس جنگلوں میں لگائی جانے والی آگ کے دھویں سے ایک لاکھ اموات واقع ہوئیں۔یہ خبر ہارورڈ اور کولمبیا یونیورسٹی کی مشترکہ تحقیق کے نتیجہ میں سامنے آئی ہے۔جس کے مطابق ان اموات میں ۹۰ فیصد انڈونیشیا اور باقی سنگاپور اور ملیشیا میں ہوئیں۔یہ آگ اصلاً جنگلات اور گھاس پھونس سے فصلوں کو بچانے کے لیے لگائی جاتی ہے جو فضائی آلودگی کا سبب بنتی ہے۔۲۰۱۵ء میں لگائی گئی آگ سے نکلنے والا دھواں کئی ماہ تک فضاؤں میں رہا۔فضائی آلودگی یا دھویں سے ۲۶ ہزار سے ایک لاکھ ۴۷ ہزار ۳سو اموات کا اندازہ کیا گیا ہے۔جس کی سالانہ شرح اموات ایک لاکھ تین سو بنتی ہے۔انڈونیشیا کے بحران سے نمٹنے والے ادارے کے مطابق چار کروڑ تیس لاکھ افراد دھوئیں سے متاثر ہوئے اور پانچ لاکھ سانس کی بیماریوں میں مبتلا ہوئے۔ماہرین ماحولیات نے اس تحقیق سے اخذ کیے گئے نتائج میں خامیوں کے باوجود اس

رپورٹ کو چشم کشا قرار دیا ہے۔(بی بی سی اردو ڈاٹ کام، ۱۹؍ستمبر ۲۰۱۶ء)

”۷۳لاکھ پناہ گزیں بچے تعلیم سے محروم“

اقوام متحدہ کے ادارہ برائے پناہ گزیں کی شائع کردہ رپورٹ کے مطابق ۷۳لاکھ پناہ گزیں بچے تعلیم سے محروم ہیں۔جیسے جیسے ان کی عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے۔صورت حال مزید خراب ہوتی جاتی ہے۔اس ادارہ کے سربراہ فلیپو گرانڈی نے کہا کہ پناہ گزینوں کی تعلیم بری طرح نظرانداز ہورہی ہے۔یہ(تعلیم) آیندہ نسل کی تعمیر میں قابل ذکر تبدیلی لانے کا موقع فراہم کرتی ہے۔۲۰۱۴ء میں اسکول جانے والے بچوں کی تعداد میں تیس فیصد اضافہ ہوا جن کے لیے بیس ہزار مزید اساتذہ کی ضرورت ہے۔ان کے لیے ایسی جگہوں کا بندوبست بھی ضروری ہے جہاں ان بچوں کے لیے کلاسوں اور دیگر ضروری اشیا کا انتظام ہو۔اکثر بچے کئی سال تک اسکول سے باہر رہنے کے سبب حصول علم میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔علاقوں کی زبان سے ناآشنائی بھی اس مشکل میں اضافہ کا سبب ہے۔(منصف، حیدرآباد، ۱۶؍ستمبر ۲۰۱۶ء)

”امریکہ میں مسلمانوں کی عدم مقبولیت“

منیسوٹا یونیورسٹی کے سماجی ماہرین کے سروے کے مطابق اس وقت امریکہ میں سب سے نامقبول و ناپسندیدہ شہری مسلمان ہیں۔تقریباً پچاس فیصد امریکی، مسلمانوں میں شادیاں کرنا نہیں چاہتے۔دس برس پہلے یہ تعداد ۳۵فیصد تھی جواب بڑھ کر تقریباً ۵۰ فیصد ہوگئی ہے۔رپورٹ میں اس کی وجہ تشدد اور دہشت گردی کے وہ واقعات بتائے گئے ہیں جو گذشتہ دہائی میں دنیا کے مختلف حصوں میں ظہور پذیر ہوئے۔اس سے قبل امریکہ کا ناپسندیدہ طبقہ دہریوں اور مذہب بیزاروں کا تھا۔ایشین ایج ۱۹ ستمبر میں شائع شدہ اس رپوٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے سہ روزہ دعوت کے ایڈیٹر نے خبرونظر میں لکھا ہے کہ امریکی یونیورسٹی کی یہ رپورٹ حیرت انگیز نہیں ہے۔دوسرا پہلو اس کا یہی ہے کہ امریکہ اور اس کے حلیفوں نے اس نظریہ حیات کے خلاف جنگ چھیڑی ہے جسے وہ اپنے استحصالی، معاشی، سیاسی وثقافتی نظام کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔کسی اور عقیدہ یا قوم سے انہیں خطرہ نہیں۔رپورٹ کی روشنی میں ایک بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ اگر امریکہ کے پچاس فیصد شہر مسلمانوں سے بیزار ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ باقی پچاس فیصد کو کوئی پریشانی نہیں ہے۔(ایشین ایج، ۱۹؍ستمبر ۲۰۱۶ء، سہ روزہ دعوت، ۲۲-۲۵؍ستمبر ۲۰۱۶ء) ک، ص اصلاحی

ادبیات

عطائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ڈاکٹر ابرار اعظمی *

حضورؐ! آپ کو کیسے پکاروں، ہائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کہ میں خطاؤں سے پر، گرد راہ پائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نہ فقر بوذرؓ و سلماںؓ ، نہ بازوئے حیدرؓ نہیں بلالؓ وابوبکرؓ بھی، خدائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

شکوہ حضرت فاروقؓ سے بھی ہوں خالی غنائے حضرت عثماںؓ و میں، خدائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اگر میں ہوتا غلامِ غلامِ سبط نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو ناز کرتا کہ میں بھی ہوں خاکِ پائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

الٰہی ، تیرا ، تری رحمتوں کا علم و یقیں ہے اس لیے بھی کہ پیغام تیرا لائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اے میرے حی و قیوم ، التجا سن لے حیات ہو مری تجسیمِ نقش پائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

الٰہی ، میرا یہ ذہن رسا ، تری تخلیق مگر یہ اس کی جلاء، صرف ہے عطائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

خوشا وہ روز کہ تکمیل ہوگئی دیں کی خوشا وہ دور کہ تشریف جس میں لائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! بُعد زمان و مکان دونوں ہیں کہا قرآن و سنت و مسکرائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نعت رسول کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ڈاکٹر اشرف رفیع **

یہ شب ماہتاب ان کے لیے ضو فشاں آفتاب ان کے لیے

زحل و مریخ و مشتری زہرہ آب و تاب شہاب ان کے لیے

کنت کنزاً کی علت غائی خلقت بے حساب ان کے لیے

فرش کے سب خزانے ان کے ہیں عرش سب بے حجاب ان کے لیے

---

* اعظم گڑھ۔

** یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ۔

عشق کی انتہا پہ ان کے قدم حسن کامل جناب ان کے لیے
طور سینا پہ تھا حجاب میں وہ اٹھ گئے سب حجاب ان کے لیے
سب صحیفے تھے اک زماں کے لیے تا ابد اک کتاب ان کے لیے
جن کے نعلین عرش تک پہنچے عبد کامل خطاب ان کے لیے
لی مع اللہ پہ عبدیت ان کی انا بشرٌ حجاب ان کے لیے
کیسے لے جاؤ گی وہاں اشرفؔ
دل و جان خراب ان کے لیے

غزل

جناب وارثؔ ریاضی*

بہار آئی نہ بازو میں ہوئے کچھ بال و پر پیدا خدا جانے مری آہوں میں کب ہوگا اثر پیدا
ازل ہی سے الٰہی! تیری دنیا میں اکیلا ہوں کوئی غم خوار ہے اپنا نہ کوئی ہم سفر پیدا
مری جاں! تیرے سنگِ آستاں کی لاج تھی مجھ سے کہ اب ہوگا نہیں مجھ سا کوئی شوریدہ سر پیدا
ہزاروں بار ٹکرائیں وہ سر دیوارِ زنداں سے کبھی ہوتا نہیں ہے سر کے ٹکرانے سے در پیدا
اگر اک راستا مسدود ہو جائے تو کیا غم ہے؟ جنونِ شوق کر لے گا ہزاروں رہ گزر پیدا
شب ہجراں کی تاریکی میں کر لیتے ہیں دیوانے فروغ اشک ہائے غم سے انوار سحر پیدا
اسی امید پر زندہ ہیں ہم شب ہائے ارماں میں کہ (۱) خون صد ہزار انجم سے شاید ہو سحر پیدا
ترستی ہے ”نگاہ آرزو“ صدیوں تو ہوتے ہیں سلیماں (۲) اور شبلی (۳) کی طرح اہل نظر پیدا
کسی کو چین سے جینے نہیں دیں گے کبھی وارثؔ
یوں ہی ہوتے رہے دہشت کے متوالے اگر پیدا

---

(۱) ڈاکٹر اقبالؒ کے ایک مشہور شعر کے دوسرے مصرعے میں تھوڑی ترمیم کے ساتھ۔ (۲) حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ۔ (۳) علامہ شبلی نعمانیؒ۔

* کاشانہ ادب، سکٹا دیوراج، بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار۔

مطبوعات جدیدہ

قرآنی دروس (اول و دوم): از پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۱۶، قیمت ۱۰۰/روپے، پتہ: ادارہ علوم القرآن، شبلی باغ، علی گڑھ اور مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲۔

اس کتاب کے فاضل مصنف کی ایک بڑی شناخت ہندوستان کے قرون وسطی کی تاریخ کے ماہر کی ہے۔انہوں نے عہد سلطنت و مابعد میں فقہ وفتاوی اور عدالت وقضا کے انتظام پر غالباً پہلی بار اپنے مطالعہ کے نتائج کو مرتب کیا، لیکن اس سے بھی زیادہ ان کی پہچان، علوم قرآن کے شیدائی کی بھی ہے جس کا عقیدہ ہے کہ قرآن مجید دنیا کے لیے نور ہدایت ہے اور ہر مومن سے یہی مطلوب ہے کہ وہ خود قرآن مجید کی روشنی سے اپنی دنیا کو منور کرے اور اپنی صلاحیت وتوفیق کے مطابق دوسروں کو بھی اس کے نور ہدایت سے فیض یاب کرے۔اسی جذبہ کے تحت انہوں نے رسالہ تذکیر غازی پور میں قرآنی احکام وہدایات کو مختصر اور آسان فہم انداز میں پیش کرنا شروع کیا، خاص خاص موضوع پر آیات قرآنی کی تشریح وتوضیح کے اس سلسلہ کو پسند کیا گیا۔توحید، نماز، روزہ، زکوۃ، حج، اطاعت خداوندی، اطاعت رسول، نیکی اور حسن عمل جیسے موضوعات کے ساتھ اور علم، قبول حق، تقوی، صبر وشکر، توبہ و استغفار، تواضع و انکسار، حلال روزی، انفاق فی سبیل اللہ، عورتوں کے معاشی حقوق، مالی معاملات پر بھی پراثر تحریریں آگئیں، درحقیقت یہی قرآن مجید کے درس کی روح ہے کہ اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق کو جانا اور پھر برتا جائے یا زندگی کو ان سے سنوارا جائے۔مولانا عزیز الحسن صدیقی صاحب نے دل کی بات کہی کہ یہ رشحات قلم سادہ اور آسان زبان میں ہونے کے سبب قاری کے دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔

قرآنیات و ادبیات: از پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۴۶۴، قیمت ۳۵۰/روپے، پتہ: شعبہ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

قرآن کریم کا تعارف، تدبر قرآن اور البیان کی ترجمہ نگاری، المنار، تفسیر ماجدی اور تیسیر القرآن

کا منہج تفسیر، چند قرآنی موضوعات کی توضیح، علوم القرآن پر چند اہم کتابوں کا جائزہ اور مولانا اسلم جیراج پوری اور مولانا امتیاز علی عرشی کی قرآنی خدمات جیسے موضوعات وعناوین سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کی کیا اہمیت ہے۔ فاضل مصنف ان خوش نصیبوں میں ہیں جن کو قرآن مجید اور اس کے علوم و معارف سے شغف ہے اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہی شغف دنیوی سرفرازی اور اخروی کامرانی کی ضمانت بھی ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے اور متنوع بھی، یعنی ترجمانی قرآن میں جہاں وہ فکر فراہیؒ کے نقیب ہیں، وہیں دوسری تفسیروں کے مطالعہ اور ان کی خوبیوں اور امتیازات کے بھی معترف ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تفسیر تدبر قرآن کے تو گویا وہ ترجمان ہیں۔ ان کے نزدیک یہ دنیا کی واحد تفسیر ہے جو اول تا آخر نظریہ نظم قرآن کے مطابق ہے۔ انہوں نے اس قول کی تائید میں اس کی ترجمہ نگاری کا جائزہ لیا کہ عربی مبین کو اردوئے مبین میں ڈھالنے کی کاوش بھی اس میں نظر آتی ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ ''قرآن کریم میں بے شمار آیات محذوفات پر مبنی ہیں، کیونکہ عربوں کے یہاں یہ چیز وبائے عام کے مانند ہے''۔ لکھا کہ ''تراجم آیات میں ادبی جھلک پوری طرح ظاہر وباہر ہے لیکن کہیں کہیں ایسا سکتہ ہے کہ سلاست دم توڑتی نظر آتی ہے''۔ ایک اور جگہ لکھا کہ (مولانا اصلاحی) نے ایک ہی لفظ کا ترجمہ مختلف مقامات میں مختلف انداز سے کیا ہے۔ مصنف کی نظر میں ''یہ حسن شاید کسی اور ترجمہ قرآن میں موجود نہ ہو مثلاً قال اور یقول کے ترجمہ سے مولانا کی اس جسارت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے''۔ یہاں جسارت اور اوپر کی مثال میں وبائے عام جیسے الفاظ کے استعمال سے مافی الضمیر، قاری پر کچھ کھلتا نہیں۔ جناب جاوید احمد غامدی کی البیان کے بیان میں انہوں نے غامدی صاحب کا یہ قول نقل کیا کہ ''میں نے اس ترجمہ میں کوشش کی ہے کہ اس کا مدعا نظم کلام کی رعایت سے اردو زبان میں منتقل کردوں، تراجم کی تاریخ میں یہ اس لحاظ سے پہلا ترجمہ قرآن ہے''۔ اس سے پہلے یہی بات مصنف نے تدبر قرآن کے بارے میں کہی، شاید اسی لیے مصنف نے فیصلہ کردیا کہ ''تدبر قرآن اور البیان کے تراجم میں بالکل ہی فرق نہیں ہے''۔ بلکہ انہوں نے مثالوں سے دکھایا کہ تفہیم، تدبر، تذکیر اور البیان ان چاروں کے ترجموں میں کوئی فرق نہیں۔ ایک جگہ لکھا گیا کہ جس طرح مولانا اصلاحی نے سورتوں کے گروپ (؟) کے سلسلے میں اپنے استاد گرامی (مولانا فراہی) سے اختلاف کیا، اسی طرح غامدی صاحب نے بھی گروپ کے باب میں اپنے استاد (مولانا اصلاحی) سے اختلاف کیا ہے۔ رشید رضا مصری کی تفسیر المنار کے متعلق صحیح

کہا گیا کہ "اس میں دعوتی پہلو بہت ابھرا ہوا ہے"۔ ایک دلچسپ موازنہ، تدبر قرآن اور تفسیر ماجدی کے درمیان ہے جس کے مطابق تفسیر ماجدی میں فکر فراہی کا منہج تو ہے لیکن بہت واضح نہیں۔ اس مجموعہ مضامین کا نام قرآنیات و ادبیات ہے۔ اس سے کچھ اشتباہ تو ہوتا ہے لیکن بعد میں کھلتا ہے کہ چونکہ قرآن مجید ادبی لحاظ سے بھی لاثانی ہے، اس لیے لفظ ادبیات کا اضافہ کیا گیا۔ قرآنی علوم سے تعلق رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب بہر حال مفید ہے اور پیش کش کے لحاظ سے دلچسپ بھی ہے۔

انجمن اسلام اور اس کی کریمی لائبریری: از جناب شمیم طارق، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۷۲، قیمت ۲۵۰/روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، پرنسس بلڈنگ، جے جے ہاسپٹل کارنر، ممبئی اور ممبئی اور اورنگ آباد کے مکتبے۔

ہندوستان کی ملی تاریخ میں انجمن اسلام ممبئی کو کسی تعارف کی ضرورت نہیں کہ یہ ان معدودے چند قومی اداروں میں شامل ہے، جن کی خدمات کا دائرہ ابتدا سے وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا۔ مسلم یونیورسٹی کی طرح یہ صرف جدید تعلیم ہی نہیں، مسلم تہذیب وثقافت کی بڑی اور روشن علامت بھی ہے۔ کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصل موضوع انجمن اسلام کی کریمی لائبریری کی تاریخ، اس کے ذخیروں کا تعارف اور کتب خانوں کی دنیا میں اس کی اہمیت ہے اور یہ تاثر صحیح بھی ہے کہ قریب ڈھائی سو صفحات میں سو صفحات سے زیادہ اسی لائبریری کا ذکر ہے۔ لیکن باقی کے ڈیڑھ سو صفحات میں انجمن اسلام کے تعلیمی مراحل، مسلم یونیورسٹی، اردو، صحافت، اشاعت، علامہ شبلی سے تعلق، محمد حاجی صابو صدیق، اسماعیل یوسف کالج وغیرہ عنوانوں سے جو معلومات بلکہ تجزیاتی اطلاعات فراہم کیے گئے، ان سے اس کتاب کی قدر بہت بڑھ گئی۔ انجمن اسلام کے قیام، اس کے پہلے بانی اور بعد کے ذمہ داروں کی اتنی جامع اور مستند تفصیل اس شان کی شاید ہی کہیں اور ملے۔ یہی نہیں ممبئی اور مسلمانان ممبئی کے عنوان سے پہلا مضمون ہی معلومات کا خزانہ ہے۔ کوکنی، نوائط، موپلا، ماہم، ممبئی تھانہ، ممبئی کے سات جزائر، کولیوں کی ابتدائی آبادی سب کا بیان ایک تاریخی تسلسل سے اس طرح ہے کہ تاریخ و جغرافیہ اور تہذیب وثقافت کے عروج و زوال کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے شوق، دلچسپی اور افادیت کا سامان خود بخود فراہم ہوتا جاتا ہے۔ ساتھ ہی کچھ بیانوں اور لہجوں کی وضاحت بلکہ درستگی بھی ہوتی جاتی ہے مثلاً

ایک بیان نقل کیا گیا کہ ''ممبئی کے کوکنی مسلمان سنی اعتقاد اور شافعی فرقہ کے ہیں''۔ فاضل مصنف نے اس بیان یا اطلاع کو گمراہ کن، اس لیے بتایا کہ کسی خاص ''فقہی مسلک'' کے ماننے والوں کی جماعت کے لیے فرقہ کا استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ صحیح کہا کہ ''فرقہ'' کا وجود عقیدہ میں اختلاف کی بنیاد پر عمل میں آتا ہے۔ میمن جماعت کے بارے میں درست کہا گیا کہ مسلمانوں کی اجتماعی فلاح کے ایسے کام جن سے ہر جماعت اور فرقے کے لوگوں کو فائدہ پہنچتا رہا ہے۔ میمن لوگوں نے سب سے زیادہ کیے، یہ بھی بالکل درست ہے کہ ممبئی کے مسلمانوں کی ملی، تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں کے اثرات ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی زندگیوں پر مرتب ہوتے ہیں۔ انجمن اسلام اس کی ایک مثال ہے۔ فاضل مصنف نے انجمن کی تمام کارگزاریوں کی داستان اس طرح بیان کی کہ ماضی وحال کا کوئی گوشہ مخفی نہیں رہا۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اردو ٹائپ کے رواج کو مقبول عام کرنے میں انجمن کا کردار بڑا فعال رہا۔ اردو صحافت کے باب میں فاضل مصنف نے بتایا کہ ۱۸۵۵ء میں بمبئی سے شائع ہونے والا اخبار ''کشف الاخبار کاشف الاسرار'' پہلی جنگ آزادی کے دوران بھی نکلتا رہا مگر ان کو افسوس ہے کہ جب بات ہوتی ہے تو اس حقیقت سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔ ہمارے لیے خاص دلچسپی کا سامان، مضمون بعنوان انجمن اسلام اور علامہ شبلی نعمانی میں بھی ہے، اس میں کچھ خیالات میں ندرت ہے جیسے علامہ شبلی کو اگرچہ انجمن اسلام سے واقفیت تھی مگر سرسید سے علاحدگی کے بعد یہ واقفیت، قربت میں بدلتی گئی، اس کی ایک بڑی وجہ فاضل مصنف کے نزدیک یہ ہے کہ سرکاری منصب ہی نہیں، تعلیم کے معاملہ میں بھی سرسید احمد خاں کی فکر طبقہ واریت سے مملو تھی اور علامہ شبلی اس سے متنفر تھے۔ وہ بدرالدین طیب جی کے سیاسی خیالات اور اس بنا پر انجمن اسلام کے ہم نوا تھے۔ اس قسم کی اور بھی باتیں ہیں جن سے کتاب کا ہر صفحہ توجہ اور غور کا طالب نظر آتا ہے، تاہم خاص گفتگو کریمی لائبریری ہی سے متعلق ہے۔ اس لائبریری کا نام قاضی عبدالکریم سے مستعار ہے، مصنف کے تحقیقی ذوق نے اغلاط کی نشان دہی کا فرض جا بجا انجام دیا ہے۔ انجمن کی ایک روداد میں قاضی عبدالکریم پلبندری چھپا تو انھوں نے واضح کیا کہ صحیح پوربندری ہے۔ کریمی لائبریری کو مشکل وقت سے بعد میں دوچار ہونا پڑا۔ کچھ دنوں کے لیے اس کے دروازے بند کردیے گئے اور بعد میں اس کا احیاء ہوا لیکن اس داستان کے بعض لمحے بڑے ناگوار بھی آگئے ہیں اور مصنف کا درد بھی سامنے آگیا کہ جن لوگوں نے اس کی حرمت کو پامال کرنے کی کوشش کی ان میں بلیک میل کرنے والے

ایک دوصحافی اور اردو خور قسم کے سیاست دانوں کے علاوہ انجمن اسلام کے ایک ایسے صدر بھی تھے جن کی اصل حیثیت دوا فروش کمپنی کے سربراہ کی تھی مگر وہ انجمن ترقی اردو ہند کی ممبئی شاخ کی سرپرستی کا دعویٰ بھی کرتے تھے۔ یہ ناراضی، مصنف سے چھپائی نہ گئی اور جملہ معترضہ کے طور پر قلم کی نوک پر درد چھلک ہی اٹھا۔ بہرحال انہوں نے اصل موضوع کا خیال رکھتے ہوئے اس لائبریری کے خزانہ کی جھلک بڑے سلیقہ سے پیش کردی۔ قرآن مجید کے تراجم میں وہاں موجود مراٹھی، گجراتی اور انگریزی ترجموں کے ذکر میں اس سہ لسانی ترجمہ کا بھی ذکر کیا جس میں ترکی، عربی، فارسی زبانیں ہیں۔ نوادر کا یہ ذکر قدرداں قارئین کے لیے گویا ایک خزانہ کا در کھولنا ہے۔ متعدد نایاب کتابوں کے سرورق کی تصویریں، شوق کو اور ہوا دیتی ہیں البتہ کتاب کی اشاعت میں جو صبر آزما مرحلے آئے اور جن سے مصنف کا قلم حرف شکایت سے آشنا ہوا، وہ واقعی افسوس کے لائق ہے۔ کسی بھی صاحب قلم کے لیے یہ اظہار آسان نہیں کہ وہ الفاظ اور قلم کی حرمت کے لیے قسطوں میں اپنی سانس اور آنکھ کی بینائی صرف کرتا رہا، تاہم اصل صلہ تو قارئین کا وہ احساس ہی ہے جو ژرف نگاہی اور دیدہ ریزی کی قدر کے نتیجہ میں ظاہر ہوتا ہے اور اس میں شبہہ نہیں کہ محنت، جستجو اور معلومات کی کثرت کی وجہ سے اس کتاب کی قدر ضرور کی جائے گی۔

تذکرہ علمائے امرتسر: از حکیم محمد موسیٰ امرتسری، مرتب جناب محمد کاشف رضا، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۴۰، قیمت ۲۴۰/روپے، پتہ: مکتبہ فیضان مدینہ، مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد اور لاہور، راولپنڈی، کراچی کے مکتبے۔

اب اس بات پر کسے یقین آئے گا کہ زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب امرتسر شہر میں مسلم آبادی اس غیر مسلم آبادی کے مساوی تھی جس میں ہندو اور سکھ دونوں تھے اور کبھی یہ شہر علماء و فضلا، صوفیہ و شعرا سے معمور تھا۔ اس شہر کو علم پرور اور علم نواز کہا جاتا تھا۔ زیر نظر کتاب میں اس شہر کے ماضی کی ایک داستان وہاں کے جید علماء کے تذکرے کی شکل میں سنائی گئی ہے۔ مولانا غلام رسول قصوری ثم امرتسری، مولانا ابوعبداللہ غلام العلی، مفتی غلام رسول قاسمی، مولانا غلام اللہ، مولانا نور احمد، سید برکت علی، مولانا محمد داؤد فاروقی، مفتی عبدالرحمٰن امرتسری، مولانا غلام محمد ترنم کے حالات کئی رسائل میں شائع ہوئے۔ لائق مرتب نے ان کو جمع کرکے زیر نظر کتاب کی شکل دے دی۔ حکیم محمد موسیٰ کو ان کے عقیدت مند معلومات کی انسائیکلوپیڈیا سے تعبیر کرتے تھے۔ مشفق خواجہ مرحوم نے لکھا کہ وہ صحیح معنوں میں مقبول خلائق

تھے۔ مسائل میں وہ مولانا احمد رضا خاں کے مسلک کے قائل و عامل تھے لیکن اس کتاب میں انہوں نے بڑی دیانت داری سے دوسرے مسالک کے علماء کی خدمات بیان کی ہیں۔ مولانا غلام العلی مسلکاً اہل سنت تھے، ان کے ذکر میں ان کے بعض مخالفین کو انہوں نے مناظرے باز مولویوں سے تعبیر کیا اور لکھا کہ ہٹ دھرمی سے قوم کے وقار اور شیرازہ بندی کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہ کتاب علماء اور ان کے زمانہ کے امرتسر کی مذہبی، علمی اور تہذیبی زندگی کی جھلک پیش کرتی ہے۔ ساتھ ہی اختلاف مسائل کے باوجود اہل علم کے مقام و مرتبہ کا اعتراف کرنا بھی سکھاتی ہے۔

مصدقات: از ڈاکٹر راہی فدائی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۲۴۸، قیمت ۱۳۵/روپے، پتہ: ۱۶۱۶، چوتھا کراس (4th کراس)، شیوارامیا لے آوٹ، ایچ بی آر لے آوٹ، (3rd کراس)، کلیان نگر پوسٹ، بنگلور۔ ۴۳۔

اس کتاب کے فاضل مصنف صاحب تصانیف کثیرہ ہیں اور اس کثرت میں نثر و شعر دونوں برابر کے شریک ہیں۔ ان کے شعری مجموعوں کے ناموں میں بھی عجب جدت و انفرادیت ہے مثلاً نتسللہ، انامل، ترقیم، نبراس، فبہا، ایہاالناس، نثری کتابوں میں ناموں کا یہ رجحان کم ہے لیکن مدرکات اور اب زیر نظر مصدقات بھی اسی قبیل یا قبیلہ سے ہے۔ جس میں علمی و ادبی مباحث ہیں۔ شخصیات اور ان کی خدمات کا ذکر ہے، تاریخی و تحقیقی اور کچھ مذہبی مضامین ہیں۔ جو فاضل صاحب کتاب کے علم، مطالعہ اور تلاش و جستجو کی وسعت کا پتہ دیتے ہیں۔ بعض مضامین معارف میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ نعت، تاریخ گوئی اور غزل کے ساتھ علم عروض کی معنویت پر ایک مضمون بہت معلومات افزا ہے۔ شخصیتوں میں مولانا علی میاں، قاری محمد طیب، ڈاکٹر سید عبدالباری اور کچھ اور اہل علم و ہنر کا ذکر ہے۔ تقاضہ زیست کے زیر عنوان احترام آدمیت، تصوف، ربا، دینی مدارس پر اظہار خیال ہے۔ اس طرح یہ کتاب ایک خوبصورت فکر و نظر اور ذہن و قلب کی صداقتوں کا مظہر ہوگئی ہے۔ اب خدا جانے یہ مصدقات کے مفہوم میں ہے یا نہیں لیکن بنگلور میں لکھنؤ کی زبان کے لطف کی تصدیق تو بہرحال ہوتی ہے۔

ع۔ص

رسید موصولہ کتب

بادل چھاؤں (خاکے): از ڈاکٹر شکیل احمد، قاسمی منزل، ڈومن پورہ، مئوناتھ بھنجن۔

قیمت=/۱۸۰ روپے

تذکرہ حکیم محمد ایوبؒ: ترتیب: صباح الدین اعظمی، حکیم محمد ایوب ایجوکیشنل فاؤنڈیشن، بلریا گنج، اعظم گڑھ۔ قیمت درج نہیں

جھیل تن میں چاند اتر گئے کئی: از شفیق پروین، مرتب شاداب، عذرا پبلی کیشنز، بنگلور۔

قیمت=/۳۰۰ روپے

حنیف نقوی کی ابتدائی تحریریں: از ڈاکٹر حنیف نقوی، مرتب ڈاکٹر شمس بدایونی، مرکز تحقیقات اردو وفارسی، گوپال پور، باقر گنج، سیوان (بہار)۔ قیمت=/۳۰۰ روپے

سرگزشت عافیہ، وامعتصماہ!: از ڈاکٹر شاہد بدر فلاحی، M-21/687,GF، خلیل اللہ مسجد، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ قیمت=/۱۲۰ روپے

شعر اساس تنقید: از عطا عابدی، امرین بک ایجنسی، احمد آباد۔ قیمت=/۲۵۰ روپے

مٹھی بھر سچ: از امیر حمزہ، ترتیب: ڈاکٹر شاہنواز احمد انصاری، مکتبہ نعیمیہ، صدر بازار، مئوناتھ بھنجن۔ قیمت=/۱۰۰ روپے

کہاں میں اور کہاں مکہ مدینہ: از ڈاکٹر سیفی سرونجی، سیفی لائبریری، سرونج (ایم پی)۔

قیمت=/۲۰۰ روپے

نقش علیم: از ڈاکٹر انور مینائی، مرتب ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی، ۲۶۶، ٹرپلیکین ہائی روڈ، فلیٹ نمبر ۱۶، رائس منڈی اسٹریٹ، چنئی۔ قیمت=/۳۰۰ روپے

نقوش افکار: از وارث ریاضی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔

قیمت=/۳۰۰ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	-/2000	موازنہ انیس و دبیر	-/100
سیرۃ النبیؐ		اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	-/100
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	-/2200	سفرنامہ روم و مصر و شام	-/200
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی		کلیات شبلی (اردو)	-/180
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	-/30	کلیات شبلی (فارسی)	-/45
الفاروق	-/300	مقالات شبلی اول (مذہبی)	-/100
الغزالی	-/200	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	
المامون	-/175	مقالات شبلی دوم (ادبی) //	-/70
سیرۃ النعمان	-/300	مقالات شبلی سوم (تعلیمی) //	-/80
سوانح مولانا روم	-/80	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) //	-/200
شعر العجم اول	-/150	مقالات شبلی پنجم (سوانحی) //	-/150
شعر العجم دوم	-/130	مقالات شبلی ششم (تاریخی) //	-/90
شعر العجم سوم	-/125	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) //	-/100
شعر العجم چہارم	-/150	مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) //	-/110
شعر العجم پنجم	-/120	خطبات شبلی مرتبہ: عبد السلام ندوی	-/80
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	-/350	انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	-/45
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی		مکاتیب شبلی اول //	-/150
الکلام	-/230	مکاتیب شبلی دوم //	-/190
علم الکلام	-/180	شذرات شبلی مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	-/220

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
October 2016 Vol- 198 (4)
RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP- 43/016
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

تصانیف ومطبوعات شبلی صدی تقریبات

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی	ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دارالمصنّفین کے سو سال	کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	علامہ شبلی نعمانی تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
۶۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس	ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۷۔	حیات شبلی (جدید)	علامہ سید سلیمان ندوی	650/-
۸۔	مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
۹۔	حیات سعدی	تصنیف: خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
۱۰۔	شبلی شناسی کے اولین نقوش	مرتبہ: ظفر احمد صدیقی	600/-
۱۱۔	شبلی ایک دبستان	آفتاب احمد صدیقی	250/-
۱۲۔	محمد علی (ذاتی ڈائری کے چند ورق) اول	مولانا عبدالماجد دریابادی	300/-
۱۳۔	متاع رفتگاں	شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۴۔	یہود اور قرآن مجید	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
۱۵۔	رسائل شبلی	علامہ شبلی نعمانی	300/-
۱۶۔	اردو ترجمہ مکاتیب شبلی	ڈاکٹر خالد ندیم	110/-